گنیش بل کا باولا

دیپک کنول



اپنے مہربان سلیم سالک
کی نذر
کنول
21/6/22

(دیپک کنول کے تازہ افسانوں کا مجموعہ)

گنیش بل کا باولا

ـــ دیپک کنول

دروبست

کتاب کا نام:۔ گنیش بل کا باولا

مصنف:۔ دیپک کنولؔ

ناشر:۔ جواہر پبلکیشنز۔ ممبئی

کمپوزنگ:۔ جواہر پبلکیشنز۔ ممبئی

سرورق:۔ سید مدثر

طابع۔ میزان سروسز

سن اشاعت:۔ 2021

کتاب کی قیمت: 350 روپیہ

Ganesh Bal Ka Bawla

by

deepak kanwal

اشو یک اور ویوان دو ایسے معصوم فرشتوں کے نام جو میری دنیا میں خوشیوں اور شادمانیوں کے پیامبر بن کے آئے ہیں اور جن کی توتلی زبان سے دادوسن کے مجھے جیسے سارا جہاں مل گیا ہے۔

دیپک کنول

گمشدہ پتہ بڈگام کشمیر

حالیہ پتہ رینائنس کو پرائیٹو ہاوسنگ سوسائٹی

پلاٹ نمبر۔9 سیکٹر،8 مہاڑا۔ مالونی

ملاڈ (ویسٹ) ممبئی۔400095

022-28804213,9769938417 -700 6751757

اہل قلم کے مخصوص آرا

☆اعلی انسانی سوچ، بہترین لفظوں کے ساتھ، بہت رواں جیسے کسی پہاڑی سے جھرنا بہہ کر زمین پر گر رہا ہو۔قاری اس بہاو کے ساتھ، واقعات کے اُتار چڑھاو کے ساتھ اُترتا اور چڑھتا ہے اور یقیناً یہ کمال فن ہے جس کی داد قدرت کو دیتا ہوں جو اپنی مخلوق میں سے ایک تخلیق (دیپک کنول) کو چن کر اس کے حوالے کر دیتی ہے۔

(طفیل اختر) ایڈیٹر "مسکراھٹ" لاھور۔

☆آپ نے سماج کے اصلاحی کرداروں سے روشناس کرایا ہے۔زبان مہذب، پاکیزہ، سادہ، رواں دواں جو قاری کو اپنے ساتھ لئے چلتی ہے۔آپ کے افسانوں کے کرداروں میں ایک ناصح ، ہمدرد، سماج کی اصلاح کرنے والے اور درد مند دل رکھنے والے لوگوں کو دیکھا جا سکتا ہے۔تمام کہانیاں کشمیری تہذیب اور ثقافت کی عکاسی کرتی ہیں جن میں چنار کی خوشبو، چشموں کا دلفریب منظر اور کشمیر کی خوبصورتی نمایاں ہے۔اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

(نارنگ ساقی) نئی دلی

☆کشمیر کے المیے کے پس منظر میں لکھی گئی کہانیاں آپ کے حساس اور درد مند دل کی آئینہ دار ہیں۔یوں بھی ان سبھی افسانوں کا تعلق دل سے ہے عقل سے نہیں۔آپ کا سلیس اوور سادہ لب و لہجہ بہت موثر ہے۔کہیں بھی کوئی اُلجھن یا معمہ بازی نہیں۔آپ کا بیانیہ اور واقعات کی روانی لائق ستائش ہے۔اُس برے وقت کی تصویریں جس کمال چابکدستی سے آپ نے اپنے قارئین کو دکھائی ہیں، کئی بار پڑھتے پڑھتے بے اختیار آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔کئی جگہوں پر آپ نے کچھ کہاوتوں کا جو برمحل استعمال کیا ہے وہ حقائق کی منظر کشی کو اور بھی دل پزیر بنا دیتا ہے۔

(مہندر پرتاپ چاند) انبالہ (ہریانہ)

☆ دیپک کنول کو افسانہ بُننے کا ہنر آتا ہے۔اپنے اس ہنر کو استمال کر کے اُنہوں نے بہت اچھی کہانیاں دی ہیں۔دیپک کنول کی کہانیاں پڑھنے کے بعد عصر حاظر کے کئی موضوع ذہن میں کھلتے ہیں۔

(احمد عثمانی)مدیر"بیباک"مالیگاوں۔مہاراشٹر

☆ دیپک کنول ہندوستان کے اُن مشہور افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں کہ جن کے افسانے پڑھنے والوں کا حلقہ بیحد وسیع ہے۔ان کے افسانے اچھے اچھے پتھر دل انسانوں کو رونے پر مجبور کر دیتے ہیں۔کشمیر کی سسکتی زندگی کو اُنہوں نے بہت قریب سے دیکھا ہے اور دل سے محسوس کیا ہے اور اسکی منظر کشی کرتے ہوئے انسانیت کے چراغ دلوں میں جلائے ہیں۔اخلاقی قدروں کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے ایسے افسانے لکھے ہیں کہ آج وہ بھائی چارے اور دنیا میں امن وامان کی فضا قائم کرانے والے بہترین افسانہ نگار تسلیم کئے جاتے ہیں۔آپ کی کہانیوں میں زندگی کی کڑوی سچائیوں کی بولتی ہوئی تصویریں نظر آتی ہیں جو پڑھنے والے کے ذہن وقلب پر گہرا اثر چھوڑتی ہے اور مجھے یہ لکھتے ہوئے بیحد خوشی ہورہی ہے کہ آپ کے افسانوں میں وہ تمام خصوصیات ہیں جو ایک اچھے افسانے کا حصہ ہوتی ہیں۔

پاکستان میں تو ان کی کہانیاں بڑی تعداد میں شائع ہوئی ہیں اور بیحد پسند کی جاتی ہیں۔اتفاق سے میرے پاس "تخلیق" "چہارسو" "ادب لطیف" "بادبان" وغیرہ آتے ہیں۔ان کی کہانیاں وہاں کے ہر پرچے میں چھپتی ہیں اور ان میں شائع ہونے والے خطوں میں سب سے زیادہ انکی کہانیاں پسند کی جاتی ہیں۔

(سیفی سرونجی)مدیر"انتساب"سرونج۔مدھیہ پردیش

☆ دیپک کنول موجودہ دور کے اُن ممتاز افسانہ نگاروں میں شامل ہیں جنہوں نے زندگی کی عمیق گہرائیوں میں اُتر کر زندگی کے مختلف پہلوں کو دیکھا،محسوس کیا اور برتا ہے۔اُن کے افسانوں

میں ایک احساس ہوتا ہے، اُسکا ردعمل ہوتا ہے۔زبان و بیان کی نزاکت ہوتی ہے اور ذہن و قلب کو متاثر کرنے کی قوت اور شدت ہوتی ہے۔ دیپک کنول کے قلم میں جہاں کشمیر کی مہک رچی بسی ہوتی ہے وہیں ہندوستان کی خوشبو قاری کو معطر کرتی ہے۔میں آج کے اہم اور فعال افسانہ نگار دیپک کنول کو اُنکی ادبی کاوشوں کے لئے نیک خواہشات اور مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

(ڈاکٹر کیول دھیر)لدھیانہ (پنجاب)

☆ دیپک کنول کی کہانیوں میں انسانی ہمسری کا وصف بدرجہ اُتم پایا جاتا ہے۔ان میں اچھے اور برے ہر طرح کے کردار اپنی چھب دکھاتے ہیں۔بیان کی چاشنی قاری کو آغاز سے انجام تک پڑھنے پر مجبور کرتی ہے۔کسی بھی تخلیق کار کے لئے یہ سب سے بڑی کامیابی تصور کی جاتی ہے۔میں دیپک کنول کو تازہ مجموعہ کی اشاعت پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

(ظفر اقبال)ایڈیٹر روزنامہ ’’زمستان‘‘۔سرگودھا (پاکستان)

☆ دیپک کنول کے بیان کا اندازِ بیان اُردو کے **لیجنڈ** کہانی کار سعادت حسن منٹو کی یاد دلاتا ہے مگر جس خاص بات کا ذکر مَیں کرنا چاہتا ہوں وہ کہانی کے کرداروں کے اوصاف میں وسعت نظری سے بیانیہ کا استعمال ہے اس کیلئے انہوں نے اپنی تحریر میں عوامی بیان کے ٹکڑوں سے کہانی کو بڑا امتمول کیا ہے وہ اپنے بیانیے میں جس طرح اُردو کی مسلمہ ضرب المثال یا محاورات کا استعمال بروئے کار لاتے ہیں اس سے کہانی کی روانی میں بانکپن آتا ہے اور اس کیساتھ ساتھ وہ عامتہ الناس کی بول چال کی زبان سے بھی حکمت بھرے محاورے چُن کر ٹانکتے چلے گئے ہیں اور یہی امر اُن کی کہانی کو بڑھاوا دیتا ہے اور کہانی کی تفہیم آسان ہوتی جاتی ہے۔زیرِ نظر کہانیوں میں انہوں نے ایسے محاورے اور جملے برتے ہیں کہ کہانی تو الگ رہی اُس کی نثر بھی دلربا ہوگئی ہے مگر اس دلربائی میں کہانی کا بنیادی خیال بھی گم نہیں ہوا۔

(مسعود تنہاؔ)ایڈیٹر ’’فکرِ نو‘‘ لاہور (پاکستان)

☆ دیپک کنول کے افسانے ایک عرصہ سے پڑھنے کو مل رہے ہیں وہ ہر بار ایک نیا

موضوع لے کر سامنے آتے ہیں اور نئے انداز سے حیران کر جاتے ہیں۔ان کی کہانیوں میں جہاں دیہاتی ماحول کی عکاسی نظر آتی ہے وہیں پر شہر کی بودوباش رکھنے والے رنگارنگ قسم کے کردار بھی اپنی جھلک دکھاتے ہیں۔وہ ان کرداروں کو اس قدر حقیقی انداز میں پیش کرتے ہیں کہ ہر فرد کو اس میں آئینہ نظر آتا ہے ۔دیپک کنول کے افسانوں میں اُردو زبان کی چاشنی بھی موجود ہے اور ہندی بھاشا کی نرملتا اور کوملتا بھی جھلکتی ہے اس لیے وہ جب اپنے کسی کردار کا مکالمہ تحریر کرتے ہیں تو اس میں زبان و بیان کی مدھرتا کے ساتھ ساتھ عہدِ حاضر کا عکس بھی دکھائی دیتا ہے۔لہٰذا وہ اپنے مکالموں کے ذریعے نہ صرف کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں بلکہ اپنے عہد کو اگلی نسل تک منتقل کرتے ہیں۔قبل ازیں ان کے افسانوں کا مجموعہ ''لال پُل کا دیوانہ'' شائع ہو کر پذیرائی حاصل کر چکا ہے۔

(آفتاب خان)شاعر،فلم رائٹر لاہور (پاکستان)

☆ میرے بھائی دیپک کنول کا شمار اُن لوگوں میں ہوتا ہے جو قلمی ریاضت کو عبادت سمجھ کر کرتے ہیں۔آپ کے علم میں ہے کہ وہ فلم نگر کے باسی ہونے کے باوجود ادب کو ہمیشہ اولیت دیتے رہے ہیں جس کا ثبوت اُن کا تازہ افسانوی مجموعہ ہے۔ہمیشہ کی مانند اس بار بھی دیپک بھائی نے مصنوعی یا بناوٹی پن سے پرہیز کرتے ہوئے کشمیر کے دونوں طرف بسنے والے انسانوں کی سچی کہانیاں کچھ اس انداز میں بیان کی ہیں کہ قاری خود کو دیپک بھائی کے احساس میں شریک پاتا ہے۔''بے غیرت'' کا جانکی ناتھ ہو،''حسن بنگالی حاضر ہے'' کا غلام حسن عرف حسن بنگالی ہو،''گھر واپسی'' کا چھبیل سنگھ ہو یا ''کہاں گیا میرا لال'' کی حلیمہ آپا ہوں سب جیتے جاگتے کردار لگتے ہیں جن سے روزمرہ کی زندگی میں ہمارا واسطہ پڑتا ہے اور یہی امر دیپک بھائی کو انفرادیت بخشتا ہے کہ وہ عام آدمی کی کہانی اس طرح لکھتے ہیں کہ جیسے وہ خود اس کردار میں ڈھل گئے ہوں۔

(گلزار جاوید)مدیر ''چہار سو'' راولپنڈی (پاکستان)

☆ دیپک کنول صاحب کے افسانوں کی قرات سے ظاہر ہے کہ مجموعی طور پر اُن کے افسانے تخلیقی جوہر (creative essence) سے مزین ہوتے ہیں کیونکہ ان میں کسی واقعہ یا کہانی

کوصحافتی انداز یا روداد نما تحریر کی طرح پیش نہیں کیا گیا ہے بلکہ کسی بھی واقعہ کو گہرے مشاہدے اور تجر بے کے بل پرفنی قالب میں ڈھال کر کہانی کا حصہ بنایا گیا ہے۔موضو عاتی طور پر دیپک کنول کے افسانوں میں دوادوار کی عکاسی نظر آتی ہے۔ایک دور کی کہانیاں کشمیر کے دور امن کی ترجمانی کرتی ہیں جیسے ''نانی خیر والی'' ''بانگی مرغا'' ''رشتے'' وغیرہ اور دوسرے دور کے افسانوں میں کشمیر کے پرآشوب دور کی المناک کہانیاں پڑھنے ملتی ہیں ۔جن میں ''کہاں گیا میرا لال'' ''سنتا کی گوری'' ''فاصلے'' ''پوشہ مال'' وغیرہ شامل ہیں۔

انکے بیشتر افسانوں میں ناسٹالجیا کا اثر بھی دکھائی دیتا ہے جس کی وجہ سے کہیں کہیں پر کہانیاں دلچسپ موڑ لیتی ہیں لیکن کئی افسانے ایسے بھی ہیں جن میں ناسٹالجیا کا اعادہ (Reputation) پلاٹ کو متاثر کرتا ہے اور قاری اُکتاہٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔

(ڈاکٹر ریاض توحیدی ۔واری پورہ ہندواڑہ کشمیر)

☆عصر حاضر کو مابعد جدید دور سے تعبیر کیا جاتا ہے۔مابعد جدیدیت اس بات پر اصرار کرتی ہے کہ کوئی بھی ادب اپنی ثقافت کا زائیدہ ہوتا ہے، جو اپنی مٹی کی خوشبو بھی رکھتا ہے اور اس کے حدود بھی۔اگر چہ دنیا ایک عالمی ماحول میں تبدیل ہو چکی ہے اور تمام اقوام عالم کا ادب ایک طرح سے عالمی میراث کی حیثیت اختیار کر چکا ہے، لیکن مفکرین جب یہ کہتے ہیں کہ ادب اپنی ثقافت ہی کی پیداوار ہے تو وہ گویا اپنی جڑوں سے واقفیت کو ناگزیر بتانا چاہتے ہیں۔

دیپک کنول کی بیشتر کہانیاں اس عصری ادبی ماحول کی نمائندہ نظر آتی ہیں۔ان کی کہانیوں کی جڑیں (یعنی کردار، ماحول، منظر، زبان) اپنی زمین میں پیوست اور شاخیں (یعنی موضوعات کے تنوع کی چھاؤں) پورے عالم بشریت کے مسائل اور واردات کا احاطہ کرتی نظر آتی ہیں۔چونکہ دیپک کنول کو کہانی کہنے کا گُر معلوم ہے اس لیے ان کی کہانیاں قاری کو مسرت سے بصیرت تک کا سفر طے کرانے میں دیگر بڑے تخلیق کاروں کے شہ پاروں کی طرح ممد و معاون بن جاتی ہیں۔ میں اس تازہ افسانوی مجموعے کی اشاعت پر تہہ دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

(ڈاکٹر مشتاق حیدرؔ)ناقد و قلمکار(شعبہ اردو ، کشمیر یونیورسٹی ، سرینگر)

1968 میں دیپک کنول جو اُن دنوں کبھی کنول بڈگامی اور کبھی ڈی کے کنول کے نام سے لکھتے تھے ''نگینہ'' کی اشاعت کے تعلق سے ہماری ادبی محفلوں میں شرکت کرنے لگے اور اس طرح ہماری دوستی آج کی تاریخ میں پچاس سال سے قائم و دائم ہے۔اُن کے افسانے پڑھتا ہوں۔وہ اپنے افسانوں میں انسانی زندگی کے نشیب و فراز اپنے انداز سے اُبھارتے ہیں اور موضوع بحث بناتے ہیں۔حال ہی میں اُن کی تخلیق ''دلیپ صاحب'' کو پڑھنے کا موقع ملا۔میں سمجھتا ہوں کہ دیپک کنول کی یہ تخلیق ہر تعلق سے فلمی دنیا کی عظیم ہستی کے تئیں خراج عقیدت ہے۔

(وحشی سعیدؔ۔افسانہ نگار ومدیر ماہ نامہ نگینہ انٹرنیشنل۔سری نگر)

☆دیپک کنول کی کہانیاں ابتداء سے ہی میرے زیر مطالعہ رہی ہیں۔اپنی ادبی شروعات سے ہی وہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اپنی کہانیوں کا موضوع بناتے آرہے ہیں، حقیقی اور فطری پہلوؤں کی عکاسی کرتے آرہے ہیں۔اُن کی کہانیوں سے مشاہدے کی باریکی اور غور وفکر کا احساس بھی ملتا ہے۔وہ اپنی کہانیوں کے لئے سادہ لیکن پُرکار زبان کا سہارا لیتے ہیں۔بڑی بات یہ ہے کہ وہ کہانی لکھنے کے ہنر سے واقف ہیں اور میرے لئے مسرت کی بات یہ ہے کہ کشمیر کے پُرآشوب دور میں بھی اپنی مٹی سے جڑے رہے۔

نورشاہ(افسانہ نگار)سری نگر۔کشمیر

☆دیپک کنول ریاست جموں وکشمیر میں بالعموم اور ریاست سے باہر بالخصوص اردو افسانے کے تناظر میں ایک معروف نام ہے۔ان کے افسانے نہ صرف اُردو کے معروف اور معیاری رسائل و جرائد کی زینت بنتے رہتے ہیں بلکہ اردو افسانوی ادب کے سنجیدہ اور باذوق قارئین اُدب کے حلقے میں انہماک ودلچسپی کے ساتھ پسند بھی کئے جاتے ہیں اور زیر بحث بھی لائے جاتے ہیں۔

اس سے قبل بھی کہا جا چکا ہے بلکہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ افسانہ نگار نے اپنے اردگرد کے ماحول سے مواد لے کر معاشرے کے معاملات ومسائل پر لکھا ہے یا بحث کی ہے۔ ہر افسانہ نگار یہی سب کرتا ہے ۔اب یہ اُس کی فنکاری یا پھر چابک دستی ہے کہ وہ کسی ہلکے پھلکے معاملے یا پھر سنجیدہ یا پیچیدہ مسئلے کو کس زاویے سے لیتا ہے اور اسے کیسے اردو افسانوی سانچے میں ڈال دیتا ہے کہ لاٹھی بھی نہ ٹوٹے اور سانپ بھی مر جائے۔

دیپک کنول کے اکثر افسانے ان کے ماضی کو درشاتے ہیں۔ وہ اپنی ماضی کی گمشدہ دنیا یا جنت میں جا کر گزرے ہوئے واقعات وکرداروں سے افسانے کے تانے بانے تلاش کر کے انہیں یادگار بنا دیتے ہیں اور اپنے افسانوی مجموعے میں اور ایک کہانی کا اضافہ کرتے ہیں۔ان کا انداز نرالا اور اچھوتا تو ہوتا ہی ہے، زبان وبیان پر بھی انہیں خاصی دسترس حاصل ہے۔اُمید کرتا ہوں کہ یہ مسئلہ یوں ہی تا دیر جاری رہے گا۔

(ڈاکٹر اشرف آثاری ۔نقاد و افسانہ نگار صدرہ بل، حضرت بل سری نگر کشمیر)

☆ دیپک کنول برصغیر ہندوپاک کے نمائندہ افسانہ نگاروں میں ایک اہم اور قابلِ ذکر نام ہے۔آج نیٹ اور مختلف سوشل نیٹ ورکس کی سہولت نے انسانی اور زمینی فاصلے کے تصور کو یکسر بدل کر رکھ دیا ہے۔اس لیے اب ایک ادیب کی بیرون ممالک کے رسائل و جرائد میں چھپنے پر کوئی حیرت نہیں ہوتی۔لیکن دیپک کنول جموں وکشمیر کے ایک ایسے افسانہ نگار ہیں جو برسوں سے ہندوپاک کے مؤقر رسائل میں چھپتے رہے ہیں۔یہ اُس وقت کی بات ہے جب نیٹ کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ادب کی دنیا میں جب سے ہوش سنبھالا ہے میں نے بارہا دیپک کنول کی کہانیاں پاکستانی جرائد میں چھپتے دیکھی ہیں اور جنہیں وہاں کے مدیران بھی ترجیحی بنیاد پر شائع کر دیتے ہیں۔پہلے شبہ ہوا تھا کہ شاید دیپک کنول پاکستان کا کوئی افسانہ نگار ہے۔جب بعد میں کشمیر آ کر پتہ چلا کہ دیپک کنول اور راقم کا وطن اور ضلع ایک ہی ہے تو اس وقت میری خوشی مزید دوبالا ہوئی۔دیپک کنول کئی افسانوی مجموعوں کے خالق ہیں۔لالی کی

مکھنی ،قصائی کی بکری، پمپوش ،سنتا کی گوری وغیرہ ان کے بہت اچھے افسانے ہیں۔دیپک کنول کے افسانوی موضوعات بھی کمال کے ہیں جن سے ان کی وسیع النظری ،سماجی حساسیت اور فکری شعور کا احساس ہوتا ہے۔افسانوں میں برتا گیا اسلوب اور زبان موصوف کی پختگی اور زبان شناسی کا پتہ چلتا ہے۔دیپک کنول نے موضوع کی مناسبت سے کردار تراشے ہیں جوان کے افسانوں کی کامیابی ہے۔وہ کرداروں کے جذبات واحساسات کوان کے رول ،مزاج اور موقع ومحل کے بموجب ابھارتے ہیں۔دیپک کنول کے افسانے فنی ،فطری اور تکنیکی خوبیوں سے مالا مال ہیں جوانہیں مجموعی طور پر عصری ادب اور اردو افسانے میں ایک نمایاں مقام دلاتے ہیں۔

(غلام نبی کمار۔محقق و نقاد۔سری نگر کشمیر)

دیپک کنول سیکولر ذہن کے مالک ہیں۔میری طرح وہ بھی اس امر حقیقی پہ کامل یقین رکھتے ہیں کہ آدمیت سے زیادہ انسانیت اہم ہے اور سب کا مالک وخالق اللہ ہے۔ہم ہندو، مسلمان، سکھ ،عیسائی اور دوسرے عقیدوں سے تعلق رکھنے والے بعد میں ہوسکتے ہیں لیکن سب سے پہلے ہمارا انسان ہونا نہایت ضروری ہے۔میرے خیال میں ایک بڑا ادیب پوری دنیا کے لوگوں کو اپنے خاندان کے لوگ سمجھتا ہے ۔اسے رنگ ونسل ،ذات پات ،بھید بھاو ،امیری غریبی اور ملکی سرحدوں سے سخت نفرت ہوتی ہے۔اس کی آنکھیں سب کو خوشحالی ،امن وسلامتی اور ترقی کی راہ پہ گامزن دیکھنے کو ترستی ہیں۔سماجی بُرائیوں کے خلاف اپنا قلمی جہاد جاری رکھتا ہے۔وہ اچھائی اور سچائی کو پسند کرتا ہے۔مزید برآں وہ ہر کسی کے عقیدے کا احترام کرتا ہے۔دیپک کنول کے بیشتر افسانوں خاص کر ''رام دین کا بندر'' میر پور کا چاند'' زون'' شنکر پورہ کا بھگوان'' گوپال پورہ کا پجاری'' اور ''لال پُل کا دیوانہ'' میں اسی سیکولر جذبے کی کارفرمائی کا احساس ہوتا ہے۔عصر رواں میں کشمیری پنڈتوں میں جہاں ویریندر پٹواری، دیپک بدکی، پریمی رومانی، پیارے ہتاش اور دوسرے قلمکار اردو ادب کی خدمت میں منہمک ہیں وہیں دیپک کنول ایک مشاق فکشن نگار کی حیثیت سے اردو کی شمع فروزاں کیے ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی (اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری (جموں وکشمیر)

اجنبی شہر بیگانے لوگ

پریم ناتھ بٹ اُن خوش نصیبوں میں سے ایک تھا جن کے گھر کسی شیتل دریا یا کسی خوشنما نیلگوں جھیل کے تٹ پر آباد ہوتے ہیں۔ پریم ناتھ کا گھر بھی حبہ کدل میں دریائے جہلم کے کنارے واقع تھا۔ یہ اُسکا پشتینی مکان تھا جس کی بنیاد اتنی مظبوط اور مستحکم تھی کہ صدیوں سے یہ پانی کے تھپیڑے سہہ رہا تھا پھر بھی نہ اُسکی بنیادیں ہلی تھیں اور نہ ہی اسکی بناوٹ میں کوئی تبدیلی آئی تھی۔ یہ مکان نہ جانے کس اینٹ گارے سے بنا تھا کہ اس دریا میں کتنی بار ایسی طغیانی آئی کہ شوریدہ سر موجوں نے اپنے ہی باندھ نگل ڈالے مگر اس مکان کا بال بیکا نہ کرسکا۔ یہ تو اسی شان بان سے کھڑا رہا جیسے یہ کل بنا ہو۔ دریائے جہلم اس مکان سے اسطرح بغلگیر تھا کہ جب پریم ناتھ سویرے سویرے سوریہ نمن کے لئے سورج پر پانی چڑھاتا تھا تو وہ کھڑکی کھول کر سیدھے اپنا لوٹا پانی میں ڈالتا تھا اور پھر پانی سے بھرا لوٹا سوریہ دیوتا کو چڑھا لیتا تھا۔ وہ اس دریا کا اس حد تک والہ وشیدا تھا کہ گھر میں غسل خانہ ہونے کے باوجود وہ گھر میں کبھی نہاتا نہیں تھا بلکہ سویرے سویرے گھر سے صابون تولیہ لے کر نکل جاتا تھا اور پاس کے گھاٹ پر جاکر وہ جہلم میں کود کر ڈبکیاں لگانے لگا تا تھا۔ جہلم میں اُتر کر وہ اپنی عمر کا حساب کتاب بھول کر ایک بچے کی طرح پانی کی لہروں سے کھیلنے لگتا تھا۔ جہلم ہمیشہ پانی سے لبریز رہتا تھا اور خرام ناز کے ساتھ بہتا رہتا تھا۔ اسکے بہاو میں جارحیت یا شوریدہ پن نہیں تھا بلکہ ٹھہراو اور حیاداری تھی۔ سبک رفتار ہو کے بھی وہ سکون سے بہتا تھا۔ اور اُسکی خاموشی میں ایک دھیما آہنگ اخفا تھا جسمیں ایک دلفریب سنگیت چھپا تھا۔ پریم ناتھ کے کانوں کو دریا کا یہ مدھر سنگیت بہت بھاتا تھا۔ رات کو جب وہ سوتا تھا تو لہریں ہلورے مارنے لگتی تھیں۔ ان لہروں سے جو سنگیت

پیدا ہوتا تھا وہ سنگیت اُسے ماں کی لوری کی طرح لگتا تھا۔گرمیوں میں جب شہر سورج کی تمازت سے جھلسنے لگتا تھا تو پریم ناتھ کو اس دریا سے اُٹھنے والی خنک ہوائیں فرحت وسکون بخشتی تھیں اور اُسکی بگڑی ہوئی طبعیت ان ٹھنڈی ٹھنڈی ہواوں سے تروتازہ اور شاداب ہوتی تھی ۔جب کبھی مینہ برسنے لگتا تھا تو مینہ کی ننھی بوندیں پانی پر گر کر سرگم چھیڑ دیا کرتی تھیں ۔ان سروں کو سننے اور سمجھنے کی مہارت اُس نے اسی دریا کے کنارے رہ کر پالی تھی۔

پریم ناتھ کے بچے چھوٹے تھے اس لئے گھر کے سبھی کام اُسے کرنے پڑتے تھے ۔وہ پوجا پاٹھ کرنے کے بعد سبزی باجی خریدنے کے لئے جب گھر سے نکلتا تھا تو سید ھےحبہ کدل پل پر پہنچ جایا کرتا تھا جہاں سبزی اور مچھلی فروش ایک قطار میں بیٹھے رہتے تھے ۔وہ قادر جو سے کمل ککڑی جسے کشمیری زبان میں ندرو کہتے ہیں خرید لیتا اور امینہ آپا سے جہلم کی مچھلیاں ۔اُسے یہ دونوں چیزیں بیحد پسند تھیں ۔ساتھ ہی خانیاری ساگ اُسکا من بھاتا تھا۔اُسکے گھر میں ہر دوسرے تیسرے دن مچھلیاں ضرور پکتی تھیں۔ان کی لذت کا کوئی ثانی نہ تھا۔وہ گوشت بہت کم کھاتا تھا مگر جہلم کی مچھلیوں کا وہ دیوانہ تھا۔

پریم ناتھ محکمہ ٹرانسپورٹ میں ایک سنیر کلرک تھا۔اُسکا ایک چھوٹا سا پریوار تھا۔ماں باپ کا برسوں پہلے انتقال ہوا تھا۔بس وہ تھا ،بیوی تھی ،ایک بیٹا اور ایک بیٹی تھی ۔دونوں ابھی طفلی میں تھے۔پریم ناتھ کی بیوی بملا ایک سگھڑ عورت تھی ۔وہ اپنے گھر کو بڑے سلیقے سے چلاتی تھی ۔اُسکا سبھاو اتنا اچھا تھا کہ محلے کی عورتیں آئے دن اُس سے ملنے آیا کرتی تھیں اور بیٹھ کے اپنا جھنگا سنانے بیٹھ جاتی تھیں۔پریم ناتھ صبح کھانا کھا کے دفتر کے لئے گھر سے نکلتا تھا تو وہ کبھی بھی کسی سواری کا استمال نہیں کرتا تھا۔اُسے پیدل چلنا پسند تھا۔اُسکا دفتر اُسکے گھر سے زیادہ دور نہ تھا۔وہ خراماں خراماں چل کر اپنے دفتر پہنچ جایا کرتا تھا۔کبھی کوئی یار دوست یا سنگی ساتھی مل جاتا تھا تو دونوں باتیں کرتے کرتے دفتر پہنچ جایا کرتے تھے۔اُن دنوں سڑکیں زیادہ تر خالی رہتی تھیں ۔اکا دکا گاڑیاں ہی سڑکوں پر نظر آتی تھیں ۔اسی کی دہائی میں لوگ پیدل چلنے کو ہی ترجیع دیتے تھے۔

پریم ناتھ کا کام کلینزوں کی حاظری کا ریکارڈ رکھنا ہوتا تھا۔کس نے کتنی چھٹی لی، کتنے دن

ڈیوٹی دی، کس گاڑی کے ساتھ دی۔ اس سب کا ریکارڈ پریم ناتھ کے رجسٹر میں ہوتا تھا۔ مہینہ گزر جانے کے بعد جب ان کے حاظری کارڈ بنائے جاتے تھے تو ان پر پریم ناتھ کے دستخط ہونے لازمی تھے تبھی اُنہیں تنخواہ ملتی تھی۔ اس دفتر میں کل ملا کر چار ملازم تھے جن میں محمد یوسف، غلام نبی، علی شیخ تین مسلم تھے جب کہ پریم ناتھ واحد ہندو تھا۔ محمد یوسف کا کام ڈرائیوروں کی حاظری کا ریکارڈ رکھنا ہوتا تھا۔ چونکہ ڈرائیور کے ذمہ ایک ٹرک ہوتا تھا اسلیئے وہ ٹرک چھوڑ کے غائب نہیں ہو سکتے تھے جب کہ کلینز آزاد پنچھی کی طرح تھا۔ آج ایک ٹرک کے ساتھ ہے تو کل دوسرے ٹرک کے ساتھ۔ سب سے زیادہ گڑ بڑ کلینز ہی کیا کرتے تھے۔ وہ کب کہاں گم ہو جائیں یہ تو ہفتوں بعد پتا لگتا تھا جب ڈرائیور آ کے دفتر میں شکایت درج کراتا تھا کہ فلاں کلینز راستے میں ہی گاڑی سے اُتر کے چلا گیا۔ پریم ناتھ کا کام تھا ایسے کلینزوں کے خلاف رپورٹ لکھنا۔ اُسی کے رپورٹ کے بنا پر اُنہیں نوکری سے معطل کیا جاتا تھا۔ غلام نبی پریم ناتھ کے ماتحت کام کرتا تھا جب کہ علی شیخ چپراسی تھا، نام تو اُسکا علی شیخ تھا مگر وہ علی چرسی کے نام سے مشہور تھا۔ وہ چرس پیتا تھا اسلیئے اُسکا نام چرسی پڑ گیا تھا۔ اُسے چرس کی ایسی لت لگ چکی تھی کہ وہ ہفتوں بھوکا رہ سکتا تھا مگر چرس کے بنا ایک دن بھی نہیں رہ سکتا تھا۔

علی شیخ سب سے پہلے دفتر پہنچ جایا کرتا تھا۔ دفتر کھول کر وہ میز کرسیاں صاف کرتا تھا اور اُسکے بعد پانی کا گھڑا بھر کے رکھتا تھا۔ اتنے میں باقی لوگ بھی آ جاتے تھے۔ جونہی پریم ناتھ کرسی پر بیٹھ جاتا تھا تو علی شیخ اُسکے لئے گرما گرم چائے لے کر آتا تھا۔ پریم ناتھ چائے کا بڑا شوقین تھا۔ سگریٹ اور چائے اُسکی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ پریم ناتھ کو چائے پلا کر وہ گم ہو جاتا تھا۔ جب وہ دس پندرہ منٹ کے بعد نمودار ہو جاتا تھا تو اُسکی آنکھیں خمار آلودہ ہوتی تھیں۔ دراصل وہ پریم ناتھ کو چائے پلا کر دفتر کے پیچھے والی گلی میں چلا جاتا تھا جو زیادہ تر سنسان ہی رہتی تھی۔ یہاں بیٹھ کر وہ سگریٹ میں چرس بھر دیتا تھا اور پھر چرس کے دو چار کش لگا کر وہ سکون پا لیتا تھا۔ چرس کے دو چار کش لگاتے ہی اُسکے چودہ طبق روشن ہو جاتے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے اُسکے اندر کسی مفکر یا کسی ملنگ کی روح حلول کر گئی ہو۔ اسکے بعد وہ جا کے دفتر میں بیٹھ کر کسی مفکر کی طرح بڑی بڑی باتیں کرنے لگتا تھا۔ سارا اسٹاف اُسکی باتوں سے محظوظ ہو جاتا تھا۔ ہر

مقامی لیڈر کی وہ بڑی خوبی سے نقل کیا کرتا تھا۔ اُسے ہر سیاست دان سے خداواسطے کا بیر تھا۔ ہر روز وہ آدھے درجن سے زیادہ مقامی اخبار خرید کر لے آتا تھا اور پینک میں آتے ہی خبروں کا بھنڈار کھول ڈالتا تھا۔ پریم ناتھ محمد یوسف اور غلام نبی ہی نہیں بلکہ بہت سارے ڈرائیور کلینز علی شیخ کے خبر نامے کے ایسے عادی ہو چکے تھے کہ جب تک وہ انہیں دنیا بھر کی خبریں نہیں سناتا تھا کوئی اپنی جگہ سے ہلتا نہیں تھا۔ خبر کتنی بھی بڑی ہو یا چھوٹی وہ جس انداز سے سناتا تھا، وہ کسی پیشہ ور نیوز ریڈر سے کم نہیں ہوتا تھا۔

علی شیخ کی سب سے زیادہ پریم ناتھ کے ساتھ بنتی تھی۔ وہ پریم ناتھ کا سب سے قریبی اور بھروسے کا آدمی تھا۔ پریم ناتھ نے علی کو حرز جان بنا کے رکھا تھا۔ علی بھی پریم ناتھ کو دل کی گہرائیوں سے چاہتا تھا۔ وہ اُسکے ایک اشارے پر اپنی جان تک قربان کرسکتا تھا۔ اُسے کب چائے پینی ہے، کب کھانا کھانا ہے ان سب چیزوں کا علی خاص خیال رکھتا تھا۔ اگر کسی دن پریم ناتھ دفتر نہیں آتا تھا تو علی دن بھر بے چین رہتا تھا۔ دفتر سے چھوٹتے ہی وہ اُس کے گھر اُسکی خیریت جاننے کے لئے پہنچ جاتا تھا۔ یہاں نہ دفتری مرتبے حائل تھے اور نہ ہی مذہبی تفاوت اس پیار و محبت میں آڑے آتا تھا۔ یہ چاروں شیر وشکر کی طرح رہ رہے تھے۔ پریم ناتھ فطرتاً بڑا اثر میلا اور ڈرپوک آدمی تھا۔ اس محکمے میں رشوت لینے کا ایسا چلن تھا کہ ہر کوئی اس بہتے پانی میں ہاتھ دھوتا تھا۔ اس محکمے میں کوئی دودھ کا دھلا نہیں تھا۔ ہر کوئی اس بے ایمانی میں شامل تھا۔ بابو ڈرائیور، کلینز سے رشوت لیتا تھا اور افسر بابو سے۔ ڈرائیور فاضل سامان لاد کر یا تیل بیچ کر اوپر کی کمائی کر لیتا تھا۔ بے ایمانی کا یہ چلن اب یہاں دستور بن چکا تھا۔ پریم ناتھ خود رشوت لینے سے ڈرتا تھا۔ یہ کام علی شیخ کا تھا۔ جب کوئی کلینز غیر حاظر رہنے کے بعد دفتر میں حاظری دیتا تھا تو سب سے پہلے اُسکا واسطہ علی شیخ سے پڑتا تھا۔ علی بڑا ماہر کھلاڑی تھا۔ وہ اُسے اس قدر ڈراتا تھا کہ کلینز اُسکے پاؤں پکڑ کر دہائی دینے لگتا تھا۔ وہ اُس کی مدد کرنے پر تبھی تیار ہو جاتا تھا جب وہ اُسکی مٹھی گرم کر سکے۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ وہ علی کی منہ بھرائی کرتا تھا۔ پھر وہ اُسے پریم ناتھ کے پاس لے جاتا تھا اور اُسے اپنے طریقے سے مناتا تھا۔ پریم ناتھ نے علی کو کھلی چھوٹ دے رکھی تھی۔ شام کو وہ پریم ناتھ کو دن بھر کی اس حرام کی کمائی میں سے ایک چھوٹا سا حصہ دے جایا کرتا تھا، باقی وہ ڈکار لیتا تھا۔ مطلب یہ کہ کام وہ پریم ناتھ سے کرواتا تھا

اور وہ مفت میں فیض اُٹھا لیتا تھا یعنی کہ انڈے سیوے فاختہ اور بچے کوے لے جائیں ۔ پریم ناتھ کو اس بات کو کوئی ملال نہیں تھا کہ علی اُسکی آنکھوں میں دھول جھونکتا ہے۔ اُسکے لئے تو یہ بات ہی قابل تشفی تھی کہ سارا الزام علی اپنے سر لے رہا ہے اور اُسے پھر بھی کچھ نہ کچھ دے جاتا ہے اسلئے اُسے جتنا بھی ملتا تھا وہ اُسی کو بہت کچھ سمجھ لیتا تھا۔

جونہی نوے کی دہائی نے دستک دی وادی کے حالات کو گرہن لگ گیا۔ دہشت کے عفریت نے اس وادی کے چین وسکون کو نگل ڈالا۔ ہر طرف افراتفری کا ماحول پیدا ہو گیا۔ علی شیخ آتے ہی پریم ناتھ کو ایسی ایسی ڈراونی خبریں سنانے لگتا تھا کہ پریم ناتھ کا دل ڈر کے مارے بیٹھنے لگتا تھا۔ وہ یہ سب کچھ دانستہ طور نہیں کر رہا تھا۔ بات کو بتنگڑ بنانے کی اُسکی شروع سے ہی عادت رہی تھی۔ وہ ہر خبر کو بڑھ چڑھ کے پیش کرتا تھا، تا کہ خبر معتبر اور دلچسپ لگے۔ سب سے پہلے اُسی نے پریم ناتھ تک یہ خبر پہنچائی تھی کہ دس ہزار افغان مجاہد گلمرگ کے راستے کشمیر میں وارد ہو چکے ہیں ۔ دفتر میں سوائے پریم ناتھ کے اس خبر پر کسی نے کان نہیں دھرا۔ اُنہیں یہ خبر دیوانے کی بڑ لگا۔ علی شیخ اس طرح کی الم غلم خبریں سنانے کا عادی تھا۔

بہت جلد اُسکی یہ خبر سچ ثابت ہوئی جب شہر میں کئی جگہ بم دھماکے ہوئے۔ اُس کے بعد حالات ابتر ہونے لگے۔ جونہی علی شیخ پریم ناتھ کے پاس بیٹھ کر اپنا خبر نامہ سنانے کے لئے بیٹھ جاتا تھا تو اُسکا جی ڈوبنے لگتا تھا۔ علی کو اس بات کی قطعی پرواہ نہیں تھی کہ اُسکی خبروں کا پریم ناتھ پر کیا ردعمل ہو رہا ہے۔ وہ تو اُسے وادی کے حالات سے باخبر کر کے اپنا فرض ادا کر رہا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ وادی میں ہو رہی افراتفری سے خود خائف تھا کیونکہ وہ مست ومدہوش رہنے والا آدمی تھا، اُسے یہ خون خرابہ کہاں بھاتا ۔ وہ تو اس فکر سے مرا جا رہا تھا کہ اگر حالات اسی طرح دگرگوں بنے رہے تو اوپر کی کمائی کیسے ہو پائے گی ۔ اُسے چرس کہاں سے ملے گی۔ وہ اس کے بنا کیسے جی پائے گا؟ اُسے اس بات کا ادراک کہاں تھا کہ اُسکی اس حرکت سے پریم ناتھ پر کیا بیت رہی ہے۔

پہلے پہل تو ہڑتالیں اور مظاہرے ہوتے تھے۔ پھر بم پھٹنے لگے اور ہلاکتیں ہونے لگیں ۔ جب قتل وغارت کا سلسلہ شروع ہوا تو اقلیتی فرقے کے کچھ افراد بھی اس قتل وغارت گری کی زد میں

آ گئے۔ بس پھر کیا تھا پورے فرقے میں کھلبلی مچ گئی ٹھیک اُسی طرح جس طرح کوئی جنگلی جانور کسی ریوڑھ پر حملہ کردیتا ہے تو سارے مویشی بے تحاشہ بھاگنے لگتے ہیں۔ کوئی دائیں تو کوئی بائیں۔ یہی حال اقلیتی فرقے کا تھا۔ وہ ایک ایک کر کے نقل مکانی کرنے لگے۔ پریم ناتھ بھی اسی فرقے کا ایک فرد تھا اسلئے وہ بھی خوف وتشویش میں مبتلا ہونے لگا۔ وہ شام کو جلدی اپنے گھر پہنچ جایا کرتا تھا اور پھر اپنے آپ کو گھر کی چاردیواری میں محصور کر کے بیٹھ جاتا تھا۔

دھیرے دھیرے اُسکے محلے کے بیشتر ہندو پڑوسی گھر چھوڑ کے بھاگ گئے۔ نفسا نفسی کا یہ عالم تھا کہ ایک بھائی کو دوسرے بھائی کے جانے کی بھنک نہیں لگتی تھی۔ پریم ناتھ کو لگا جیسے وہ اپنے کاروان سے بچھڑ کے رہ گیا ہے۔ وہ محلے میں اکیلا رہ گیا تھا۔ اُسکے اگل بگل کے سارے گھر خالی ہو چکے تھے۔ اُسکی بیوی بملا اپنے بچوں کا تحفظ چاہتی تھی۔ وہ اُنہیں گھر میں آٹھوں پہر بٹھا کے نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ باہر جاتے تو اُنکی سلامتی کی کوئی ضمانت نہیں تھی۔ وہ کہیں بھی کراس فائرنگ کی زد میں آسکتے تھے یا کسی ملی ٹنٹ کی گولی کا نشانہ بن سکتے تھے۔ بملا پریم ناتھ کے سر پڑ گئی کہ وہ بھی اُنہیں جموں لے چلے۔ گھر چھوڑنے کے خیال سے ہی پریم ناتھ کا کلیجہ منہ کو آرہا تھا۔ وہ کیا کرے اُسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ آخر ایک دن اُسنے بھی گھر چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ فیصلہ بھی اس رازداری سے لیا کہ کسی کو بھنک لگنے نہ دی۔

اُسنے ایک سوموگاڑی کا انتظام کیا اور اُسے رات کو آنے کے لئے کہا۔ شام سے ہی اُنہوں نے چھوٹا موٹا سامان باندھ کے رکھا تھا۔ رات کو جب سومو آگیا تو وہ چوروں کی طرح گھر سے نکلے اور اُنہوں نے گاڑی میں کچھ سامان ڈالا۔ پریم ناتھ آخر میں گھر سے نکلا۔ اُسکے ہاتھ میں تالا تھا۔ اُسکے ہاتھ کانپ رہے تھے اور دل رو رہا تھا۔ جس گھر میں آ کے وہ سکون وانبساط محسوس کرتا تھا آج وہ اُسی گھر کو تالا لگانے والا تھا۔ اچانک اُسکی آنکھوں کے سوتے اُبل پڑے اور وہ لاکھ کوشش کے باوجود اپنے آنسو روک نہیں پایا۔ وہ دروازے سے سر جوڑ کر بہت دیر تک پھوٹ پھوٹ کے روتا رہا۔ جب سوموڈرائیور نے پیچھے سے آواز دی تو اُسنے بھاری من سے دروازے پر تالا ڈالا اور پھر وہ اپنے وجود کو گھسیٹتا ہوا گاڑی

تک لے آیا اور جا کے ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر نڈھال ہو کے بیٹھ گیا۔ادھر وہ سامنے کی سیٹ پر بیٹھا رو رہا تھا اور اُدھر پچھلی سیٹ پر بیٹھی بملا رو رہی تھی۔دونوں کو لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے پران یہیں چھوڑ کے جا رہے ہیں اور خالی شریر لے کے جا رہے ہیں۔

راستے میں وہ گھر کو یاد کر کے آٹھ آٹھ آنسو بہاتا رہا۔ماضی کی یادیں ایک فلم کی ریل کی طرح اُسکی نگاہوں کے سامنے چلنے لگیں۔وہ خوشگوار لمحے ،وہ یار دوست اُسے ایک ساتھ سب یاد آ گئے۔اُسنے سوچا کہ وہ خالی گھر چھوڑ کے نہیں جا رہا ہے بلکہ اپنے ماضی کا بیش بہا خزانہ چھوڑ کے جا رہا ہے۔وہ ایک گھر سے ہی محروم نہیں ہو رہا تھا بلکہ وہ خانیاری ساگ ،وہ جہلم کی مچھلیاں ،وہ ولر کے ندرو،اب اُسے ملنے والے نہیں تھے۔وہ ان چیزوں کے لئے ترستا رہے گا۔جموں شہر میں اُسے چنار کے خنک سایے نہیں ملیں گے۔جہلم کے ٹھنڈے تھپیڑے اُسکے بدن کو نہیں چھوئیں گے،ڈل کے کمل نہیں ملیں گے جنہیں وہ شو جی کی مورتی پر ہر شیوراتری کے تیوہار پر چڑھالیا کرتا تھا۔وہ ان ساری نعمتوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم ہونے والا تھا۔وہ سوچتا رہا اور روتا رہا۔گھر چھوڑنے کا تکلیف دہ اور جان گسل احساس اُسے اندر ہی اندر ریزہ ریزہ کئے جا رہا تھا۔

راستے میں اُسنے کچھ نہیں کھایا۔بس پانی کے دو چار گھونٹ پی کر وہ گاڑی میں ہی بیٹھا رہا۔اُسکے بچے اس بات سے بے خبر تھے کہ اُن کا باپ اس وقت کس درد و تکلیف سے گزر رہا ہے۔وہ نہ سیاست جانتے تھے نہ اُنہیں کشمیر میں چل رہی شورش کے پس منظر کا کوئی ادراک تھا۔وہ تو ایسے خوش تھے جیسے وہ پکنک پر جا رہے ہیں ڈرائیور نے گاڑی راستے میں کھانے کے لئے روکی تو وہ اُتر کر ایک ڈھابے میں گھسے اور اُنھوں نے پیٹ بھر کے کھانا کھالیا۔بملا نے اُن کا ساتھ تو دیا مگر اُسنے کھانا نہیں کھایا بس ایک کپ چائے سے اپنی بھوک مٹالی۔وہ بھی کافی اُداس اور غمگین تھی۔ہوتی بھی کیوں نہیں۔جس گھر کو اُسنے الوداع کہہ دیا تھا اُس گھر کا بنانے میں اُسکا بہت بڑا ہاتھ تھا۔تنکہ تنکہ جوڑ کے اُس نے اس گھر کو بنائے رکھا تھا۔ویسے بھی ہر عورت کا اپنے گھر کے ساتھ ایک جذباتی رشتہ ہوتا ہے۔وہ گھر جب اُس سے چھن جائے تو اُسے لگتا ہے جیسے اُسکا سب کچھ چھن گیا ہو۔

ادھر پریم ناتھ جب دفتر نہیں آیا تو علی شیخ فکر مند ہونے لگا۔ وہ بے چینی سے اُسکا انتظار کرنے لگا۔ جب وہ شام تک کہیں دکھائی نہیں دیا تو علی شیخ بڑا اُداس اور فکر مند ہونے لگا۔ دفتر بند ہوتے ہی وہ سیدھے پریم ناتھ کے گھر پہنچ گیا۔ گھر کے دروازے پر آہنی تالا دیکھ کر وہ دھک سے رہ گیا۔ اُسے اتنا بڑا دھچکا لگا کہ وہ دھم سے نیچے بیٹھ گیا اور منہ گھٹنوں میں ڈال کر رونے لگا۔

اگلے روز جب وہ دفتر پہنچا تو وہ کافی مضمحل اور تھکا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ دراصل اُس نے کل رات سے کچھ بھی کھایا پیا نہ تھا، نہ وہ رات کو سویا تھا۔ وہ پوری رات بس سگریٹ پیتا رہا اور روتا رہا اُس شخص کے لئے جو اُسکا سگا نہیں تھا پھر بھی اپنا سا لگتا تھا۔ جب اگلے روز وہ دفتر پہنچا تو اُسے دیکھ کے بابو یوسف نے اُس سے پریم ناتھ کے بارے میں استفسار کیا تو وہ پہلے سے ہی بھرایا ہوا بیٹھا تھا، برہم ہو کے بولا۔

''وہ سالا بھی بھاگ گیا۔''

اس خبر سے ماحول میں ایک پل کے لئے سکوت طاری ہو گیا۔ علی شیخ ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا اور پھر پریم ناتھ کی خالی کرسی کو دیکھ کر اُسکی آنکھیں بھر آئیں اور وہ بہت دیر تک سبکتا رہا۔

پریم ناتھ کا سفر آسان نہ رہا۔ گاڑی راستے میں کئی جگہ گھنٹوں کھڑی رہی۔ جگہ جگہ گاڑیوں کی تلاشی ہوتی تھی جسکے سبب بہت بڑا جام لگ جاتا تھا۔ اُنہیں اس جام سے نکلنے میں گھنٹوں لگ جاتے تھے۔ پھر جا کے دوسرے جام میں پھنس جاتے تھے۔ دن کے چار بجے وہ اُدھمپور پہنچ گئے۔ بچے تو تھکن سے نڈھال ہو چکے تھے۔ سفر تھا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

علی دو دن سے شام ہوتے ہی پریم ناتھ کے مکان کے باہر بیٹھ کر اپنے دوست کے جانے کا سوگ منانے لگا تھا۔ اُسے یہ سدھ ہی نہیں رہی کہ رات ہو گئی اور سارا شہر سنسان ہو گیا۔ وہ بس دروازے پر بیٹھا پریم ناتھ کا انتظار کرنے لگا جیسے وہ لوٹ کر آنے والا ہو۔ نہ جانے اُسے ایسا کیوں لگ رہا تھا کہ وہ اُس سے دور رہ نہیں پائے گا۔ وہ بھی اسی طرح تڑپ رہا ہو گا جیسے وہ تڑپ رہا ہے۔ اُسے یقین تھا کہ اُس کے دل کی فریاد اوپر والے تک ضرور پہنچ جائے گی۔ وہ سوائے فریاد کے اور کر ہی کیا سکتا تھا۔

وہ دوسرے دن رات کو جموں پہنچ گئے۔ اچانک گاڑی ایک جھٹکے ساتھ رک گئی۔ پریم ناتھ گاڑی سے اُترا تو کیا دیکھا کہ تھوڑی دور لوگوں کی بھیڑ کھڑی ہے پریم ناتھ بھی آگے بڑھ گیا۔ اُسنے دیکھا کہ کئی سارے کتے ایک مریل سے کتے پر ٹوٹ پڑے تھے۔ کوئی اس غریب کو بچانے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ سارے تماش بین بنے کتوں کی اس لڑائی کا مزہ لے رہے تھے۔ بڑی ہمت کر کے پریم ناتھ نے بھیڑ میں کھڑے ایک آدمی سے پوچھا۔

''مہاراج یہ کتے آپسمیں کیوں لڑ رہے ہیں؟''

''مہاراج وہ جو کالا کتا ہے نا جو لہولہان ہو چکا ہے وہ باہری کتا ہے جوان کتوں کے علاقے میں گھس آیا ہے۔ وہ اُسے اپنے علاقے سے کھدیڑنا چاہتے ہیں۔ کیا ہے مہاراج کہ ہر کتے کا اپنا علاقہ ہوتا ہے، جیسے ہم انسانوں کا۔ جسطرح ہم باہری لوگوں کو یہاں سے کھدیڑنے کے لئے اندولن کر رہے ہیں اسی طرح یہ کتے بھی اپنے علاقے کو باہری کتوں کو دور رکھنے کے لئے لڑ رہے ہیں۔''

پریم ناتھ کو اس آدمی کی باتیں سن کر کرارا سا جھٹکا لگا۔ اُسنے سوچا کہ وہ بھی اسی کتے کی طرح باہری آدمی ہے جو دوسرے علاقے میں رہنے جا رہا ہے۔ کل اگر یہ بھی لام بند ہوئے اور اُنہوں نے اُسے یہاں سے کھدیڑا تو وہ کہاں جائے گا۔ یہ شہر اُسکے لئے اجنبی ہے۔ یہاں کے لوگ اسکے لئے اجنبی ہیں۔ اُسکے اپنے لوگ تو کشمیر میں ہیں۔ اُسکے حبہ کدل علاقے میں ہیں جہاں کا وہ بسکین ہے۔ یہ تو ڈوگروں کا شہر ہے۔ یہاں تو اُن کا بول بالا ہے۔ یہاں اُسکی مدد کے لئے کون آگے آئے گا۔ یہاں اُسکی فریاد کون سنے گا۔ وہ کہتے ہیں نا کہ اپنا مارے گا پھر بھی چھاؤں میں بٹھائے گا۔ یہاں تو کوئی اُسکے منہ پانی کی ایک بوند نہیں ڈالے گا۔ مرنا جینا تو اوپر والے کے ہاتھ میں ہے۔ اُسے اگر مرنا ہوگا تو یہاں بھی مرے گا مگر یہاں اُس پر کوئی دو گز کفن نہیں ڈالے گا۔ وہ اگر اپنے کشمیر میں مرے گا تو اُسکے اپنے لوگ اُسے بے کفن نہیں چھوڑیں گے۔ اگر کل انہوں نے اسے یہاں سے کھدیڑا تو پھر وہ کہاں جائے گا۔ یہ سوال اُسکے دل و دماغ میں ایک ایک کر کے اُٹھنے لگے اور ان سوالوں کا اُس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ ایک عجب سی اُتھل پتھل اُسکے دل و دماغ میں مچنے لگی۔ اُسے لگا جیسے وہ طوفانی تھپیڑوں میں گھر

گیا ہو۔ وہ کیا کرے کہاں جائے اُسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اچانک وہ گاڑی کے پاس چلا گیا اور اُس نے ڈرائیور کو گاڑی سے سامان اُتارنے سے منع کر دیا۔ بملا حیران ہو کے اُسکی طرف دیکھنے لگی۔ بچے جو گاڑی سے نیچے اُتر جانا چاہتے تھے، باپ نے اُنہیں گاڑی میں ہی بیٹھنے کے لئے کہا۔ وہ سب گاڑی میں بیٹھے رہے۔

''ڈرائیور صاحب گاڑی واپس موڑئے؟''

''واپس کہاں؟''

''واپس اپنے گھر''

بملا کی آنکھوں میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ پریم ناتھ جاکے اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اُسے لگا جیسے وہ چاردھام کی یاترا کر کے گھر لوٹ رہا ہو۔



بند گلے کا کوٹ

میرے والد محترم جتنے خوش مزاج تھے اُتنے ہی خوش لباس بھی۔ وہ جب بھی گھر سے شہر کی طرف نکلتے تھے تو سوٹ بوٹ میں نکلا کرتے تھے۔ سرمئی اور کالے رنگ کے بند گلے کے کوٹ اور اُنہی رنگوں سے ملتی جلتی پتلونیں اُنکی پہچان بن گئی تھی۔ وہ کسی شادی کی تقریب میں جائیں یا کسی کی تعزیت میں لباس میں رتی بھر بھی تبدیلی نہیں ہوتی تھی۔ وہ جب بازار سے گزرتے تھے تو لوگ اُنہیں دور سے ہی پہچان لیتے تھے۔ ان کے پاس اسطرح کے دو سوٹ تھے۔ ایک میلا ہو جاتا تھا تو دوسرا پہن لیتے تھے۔ یہ دونوں سوٹ اُنہیں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھے۔ ان دونوں سوٹوں کے ساتھ اس والہانہ لگاؤ کی وجہ یہ تھی کہ ایک سوٹ اُنکے ماں باپ نے اُنکے لئے تب سلوایا تھا جب وہ دلہا بنے تھے اور ہماری اماں کے سنگ سات پھیرے لئے تھے۔ دوسرے سوٹ کے ساتھ جذباتی وابستگی یہ تھی کہ یہ سوٹ اُنہیں سسرال سے تحفے میں ملا تھا وہ بھی اُس دن جب وہ شادی کے بعد پہلی بار اپنے سسرال گئے تھے۔

ایک دن کیا ہوا کہ والد صاحب جب کالے رنگ کا کوٹ پہننے لگے تو اُنہوں نے دیکھا کہ کوٹ کا استر لٹک رہا تھا۔ دراصل اسکی سلائی نکل چکی تھی اسلئے وہ موٹے آدمی کی کھال کی طرح کوٹ کے اندر سے لٹک رہا تھا۔ ہمارے پڑوس میں ایک درزی ہوا کرتا تھا جس کا نام محی الدین تھا۔ محی الدین درمیانی عمر کا تھا پر تھا بڑی رنگین طبعیت کا مالک۔ اب تک دو شادیاں کر چکا تھا۔ پہلی والی چیچک کی نذر ہو گئی تھی۔ اُسکے بعد ایک رانڈ سے نکاح کیئے۔ وہ زیادہ دنوں تک ٹک نہیں پائی۔ اُس پر مرگی کے دورے پڑتے تھے۔ ایک دن وہ بھی چل بسی۔ دونوں سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اب وہ تیسری کو سنبھالنے کے لئے تیار بیٹھا تھا مگر کوئی کنواری قابو میں نہیں آرہی تھی۔ اپنے آپ کو جوان ظاہر کرنے کے لئے وہ اپنی داڑھی

اور بالوں میں خضاب لگایا کرتا تھا وہ بھی ایکدم سستی کوالٹی کا جو منہ اور گردن تک پھیل جاتا تھا اور اچھے بھلے محی الدین کا منہ کالا ہو جاتا تھا اور وہ کوئی کالا بھجنگ لگتا تھا۔ عمر بڑھنے کے ساتھ بینائی بھی کسی حد تک کمزور ہو چکی تھی اسلئے کام کرتے وقت عینک کا استمال کرنا پڑتا تھا۔ عینک پہن کر ہی وہ سوئی میں دھاگہ ڈال سکتا تھا پر جونہی کوئی جوان لڑکی دکان پر آتی تھی تو فوراً چشمہ نیچے اُتار دیتا تھا اور منچلوں جیسی حرکتیں کرنے لگتا تھا۔ لڑکی نے دو میٹھے بول کیا بولے کہ وہ ریشہ خطمی ہو جاتا تھا اور لڑکی کے آگے پیچھے کتے کی طرح دم ہلانے لگتا تھا۔ وہ جیسا بھی تھا پر تھا بڑا کاریگر آدمی۔ اُسکی سلائی کٹائی کا کوئی جواب نہیں تھا۔ بنا ناپ لئے وہ کپڑا اسل دیتا تھا۔ کیا مجال کہ کہیں اُنیس بیس کا فرق رہ جائے۔

ایک دن والد صاحب اپنا کوٹ لے کر محی الدین کی دکان پر آ گئے۔ گاوں میں ہر کوئی والد صاحب کی کافی عزت و تعظیم کیا کرتا تھا۔ والد صاحب نے محی الدین کو کوٹ دکھاتے ہوئے کہا۔

''محی الدین، اس کوٹ کو زرا دیکھو۔ اسکی جوانی بھی پامال ہونے لگی ہے۔ یہ دیکھو اندر لگا استر کس طرح لٹک رہا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے کوئی سانپ اپنی کنچلی اُتار رہا ہو۔ تم زرا اسے اپنی سوئی دھاگے سے سل کر اپنی طرح جوان کر دینا تاکہ اس کی جوانی کا بھرم بنا رہے''

والد صاحب نے کوٹ کی آڑ لے کر جس طرح محی الدین پر چوٹ کی تھی اُسنے اُس چوٹ کو ہنسی کے لبادے سے ڈھک لیا۔ اُسنے اپنے ہاتھوں میں کوٹ لیا اور پھر ایک مشاق جراح کی طرح اُسے اندر باہر سے ٹٹول کے دیکھا اور پھر اُسے ایک کونے میں رکھ کر والد صاحب سے کہا۔

''کام زیادہ نہیں ہے البتہ ہے زرا ٹیڑھا۔ آج میں کہیں جا رہا ہوں اسلئے آج اسکی سلائی نہیں کر پاوں گا۔ کل سویرے سب سے پہلے میں اس کوٹ کی مرمت کر لوں گا۔ کل شام کو لے کر جائیے گا''

''کہیں لڑکی دیکھنے تو نہیں جا رہے ہو؟''

محی الدین شرما کر بولا۔

''ایسا ہی کچھ سمجھ لیجئے۔ کیا کروں۔ اکیلا ہوں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ اکیلا ہنستا بھلا نہ روتا۔ ایک سال سے کوشش میں لگا ہوں کہ کہیں بیل منڈھے چڑھ جائے پر بات بن نہیں پا رہی ہے۔ معاف کرنا کول صاحب اس وقت کافی عجلت میں ہوں۔ کل شام کو پوری کہانی سناوں گا''

والد صاحب کو بھی کوئی جلدی نہیں تھی۔ وہ کوٹ وہاں چھوڑ کر چلے گئے۔ محی الدین نے ترت پھرت اپنی دکان بڑھالی اور وہ پیچھے مڑے بنا آندھی کی طرح نکل گیا۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب کشمیر میں غربت وافلاس کا دور دورہ تھا۔ گاوں کے مقدم کے پاس ایک سیاہ اچکن اور پاجامہ ہوا کرتا تھا جو گاوں میں ہونے والی ہر لڑکے کی شادی میں استمال ہوتی تھی۔ ایسے میں کسی کے پاس دو سوٹ ہونا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

محی الدین مست مولا آدمی تھا۔ وہ کوٹ دکان میں پھینک کر چلا گیا۔ دو دن تک اُسنے دکان نہیں کھولی۔ پتا چلا کہ وہ اپنے رشتے کے سلسلے میں کہیں دور نکل چکا تھا۔ آنے جانے میں دو دن لگے۔ والد صاحب تین دن تک لگا تار اُسکی دکان کا طواف کرتے رہے۔ تیسرے دن جب اُسنے دکان کھولی تو اُسے لگا جیسے اُسکی غیر حاظری میں کوئی دکان میں گھس چکا تھا۔ ہر چیز اُلٹ پلٹ کے رکھی ہوئی تھی۔ اُسنے جب والد صاحب کا کوٹ تلاش کیا تو کوٹ نہ پا کر وہ دھک سے رہ گیا۔ کوٹ دکان سے غائب ہو چکا تھا۔ وہ چکرا گیا۔ کوٹ کا غائب ہونا اُسکے لئے مصیبت کھڑی کر سکتا تھا وہ بیٹھ کر اپنا ماتھا پیٹنے لگا۔ اتنے میں کئی لوگ جمع ہو گئے۔ اُنہوں نے اُس سے پریشانی کا سبب پوچھا تو جواب میں وہ بچے کی طرح رونے لگا۔ اتنے میں والد صاحب اپنا کوٹ لینے آ گئے۔ جب اُنہوں نے دیکھا کہ محی الدین کے دکان کے آگے ایک بھیڑ جمع ہے اور محی الدین ان کے بیچ بیٹھا ایک بیوہ کی طرح سیاپا کر رہا ہے تو والد صاحب گھبرا گئے اُنہوں نے محی الدین سے پوچھا۔

''کیا بات ہے تم رو کیوں رہے ہو''

''کول صاحب غضب ہو گیا، میرے دکان میں چوری ہوئی ہے۔ کوئی مردود بہت سارے کپڑے چرا کے لے گیا ہے۔''

''میرا کوٹ؟'' والد صاحب نے ہڑبڑا کے پوچھا۔

''آپ کا کوٹ بھی غائب ہے''

یہ خبر سن کر والد صاحب من مسوس کر رہ گئے۔ اُنھوں نے محی الدین سے جلبلا کے کہا۔

''میں تمہیں سات خون معاف کروا سکتا ہوں مگر اپنا کوٹ میں تمہیں کسی بھی قیمت پر ہضم کرنے نہیں دوں گا۔ تمہیں میرا کوٹ واپس کرنا ہی ہوگا۔''

محی الدین قسمیں کھاتا رہا کہ اُسنے کوٹ کہیں چھپایا نہیں ہے بلکہ کوئی مردود اُسے چرا کے لے گیا ہے۔ والد صاحب اُسکی کوئی بھی صفائی سننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اُنھوں نے اُسے ایک رات کی مہلت دی۔ محی الدین آفت میں پڑ چکا تھا۔ وہ ایک رات میں کوٹ کہاں سے لے کر آئے۔ وہ عورتوں کی طرح ماتھا پیٹ پیٹ کر رونے لگا۔

اگلے روز جب کوٹ نہیں ملا تو والد صاحب نے پولیس میں سچ مچ شکایت درج کی۔ پولیس بھلے ہی دیگر معاملوں میں پھسڈی ثابت ہو جائے مگر چوری چکاری کے معاملہ ہو تو وہ ایسی چستی پھرتی دکھانے لگتی ہے کہ اولیمپک کے کھلاڑی بھی دنگ رہ جاتے ہیں۔ اُنھوں نے محی الدین کو اُٹھا لیا اور اُسے حوالات میں ڈال دیا۔ حوالات میں ڈال کر اُنھوں نے مار مار کر اُسکا بھرکس نکال دیا۔ وہ ایک طرف مار کھا رہا تھا اور دوسری طرف اُسے جتنی بھی قسمیں یاد آ رہی تھیں وہ کھائے جا رہا تھا۔ ظالم پولیس والوں کا کلیجہ کہاں پسیجنے والا تھا۔ وہ تو اُسکی پٹائی کرتے جا رہے تھے اور محی الدین کا ایک ہی جواب تھا کہ اُسکا اس چوری میں کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ مقدم کے دخل سے محی الدین کو دو دن کے بعد حوالات سے رہا کر دیا گیا مگر اُسکی حالت ایسی تھی کہ وہ سہارے کے بنا ایک قدم نہیں چلا پا رہا تھا۔ پولیس والوں نے اُسکی ہڈیاں توڑ کر رکھ دی تھیں۔

والد صاحب کا ایک سوٹ آدھا رہ گیا تھا۔ بس اب ایک ہی سوٹ سے کام چلانا تھا۔ مالی حالات بھی اب اتنے مستحکم نہیں رہے تھے کی وہ دوسرا کوٹ سلوانے کے بارے میں سوچتے۔ اسلئے وہ اب سوٹ کا ستمال خال خال موقعوں پر ہی کیا کرتے تھے۔ وہ جب بھی محی الدین کی دکان کے سامنے

سے گزرتے تھے تو نگاہ اُٹھا کر بھی اُسکی طرف نہیں دیکھتے تھے۔ وہ اب بھی یہی سمجھ رہے تھے کہ محی الدین نے ہی اُنکا کوٹ غائب کر دیا تھا۔

ایک دن کیا ہوا کہ اسی گاوں کے ایک بدمعاش رفیق شاہ باز کے گھر پر ایک چوری کے سلسلے میں چھاپہ مارا۔ گھر سے بہت ساری چیزیں برامد ہوگئیں۔ مال مسروقہ میں والد صاحب کا کوٹ بھی شامل تھا۔ وہ اب نام کا ہی کوٹ رہ گیا تھا۔ رفیق شاہ باز نے اس کوٹ کے تیا پانچے کر ڈالے تھے۔ کوٹ کی دونوں آستانیں کاٹ ڈالی تھیں۔ اسے کوٹ سے واسکٹ بنا دیا تھا۔ دراصل وہ اس بات سے باخبر تھا کہ اگر یہ کوٹ ثابوت اور صحیح حالت میں رہا تو کسی نہ کسی دن یہ اُسے آفت میں ڈال سکتا ہے اسلئے کوٹ کی پہچان مٹانے کے لئے اُسنے کوٹ کو واسکٹ بنا دیا۔ اُسکی یہ کوشش بے کار ثابت ہوئی۔ بنا آستین کے بھی والد صاحب کا کوٹ پہچانا گیا اور والد صاحب کو اس بابت خبر کی گئی۔ والد صاحب نے جب اپنے کوٹ کی حالت زار دیکھی تو اُنکا خون کھول اُٹھا۔ اُنہوں نے تھانیدار سے کہا کہ وہ رفیق شاہ باز کا مار مار کر بھرکس نکال دیں۔ اُسکی ہڈیاں توڑ کر رکھ دے تا کہ وہ پھر کسی کے گھر ڈاکہ نہ ڈال سکے۔

کئی سال بیت گئے۔ والد صاحب ایک ہی سوٹ سے گزارہ کرتے رہے۔ اب اُس سوٹ کی بھی ہیت بگڑتی جا رہی تھی جگہ جگہ اُسکے پھونسڑے نکل آئے تھے۔ گھر میں چھوٹے سے لے کے بڑے تک سبھی والد صاحب کے سر پڑ گئے کہ وہ نیا سوٹ سلوائیں۔ پہلے وہ ٹال مٹول کرتے رہے مگر جب اماں پیچھے پڑ گئیں تو والد صاحب نیا سوٹ سلوانے کے لئے تیار ہو گئے۔ اُنہوں نے جمال دین بزاز کی دکان سے سوٹ کا کپڑا خریدا۔ سرمئی رنگ کے گبرڈین کا کپڑا۔ وہ یہ کپڑا لے کر اپنے خاندانی درزی غلام نبی کے پاس گئے جسکی مہاراج بازار میں ایک چھوٹی سی دکان تھی۔ علیک سلیک کے بعد والد صاحب نے کپڑا آگے بڑھایا۔ غلام نبی نے کپڑے کو ماپا۔ کپڑے کو برابر پا کر اُسنے والد صاحب کا ناپ لیا اور پھر اپنی چھوٹی سی کاپی پر لیا ہوا ناپ درج کیا۔ والد صاحب کو ایک ہفتے کے بعد آنے کو کہا۔ والد صاحب خوشی خوشی گھر لوٹ آئے۔

اسی بیچ اماں کی طبعیت بگڑ گئی۔ ہم سب لوگ اماں کی طبعیت کو لے کر کافی تناو میں

رہے۔ وہ ایک ہفتے اسپتال میں رہی۔ ایک ہفتے کے بعد جب ہم اُنہیں اسپتال سے گھر لے کے آرہے تھے تو سری نگر کے مہاراجہ بازار میں ایک جج کو دن دہاڑے قتل کیا گیا۔ یہ خبر سن کر ہم سب لرز کر رہ گئے۔ کشمیر میں شورش کا آغاز ہوا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ شورش جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ والد صاحب جب بھی سوٹ لانے کے لئے گھر سے نکلتے تھے تو اُنہیں آدھے راستے سے لوٹ آنا پڑتا تھا۔ یا تو ہڑتال ہو جاتی تھی یا کہیں پر بم دھماکہ جس وجہ سے آمدرفت پر قدغن لگ جاتا تھا۔ کشمیری امن چین کے ماحول میں جینے کے عادی رہے ہیں اسلئے جب حالات بگڑنے لگے تو ہم سبھی کو تشویش ہونے لگی۔ والد صاحب چاہ کر بھی اپنا سوٹ سری نگر سے لا نہ سکے۔

اقلیتی فرقے کی ہجرت کا دور شروع ہو گیا تھا۔ سری نگر کے کئی محلے جہاں کشمیری پنڈتوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کرنے لگے تھے۔ یہ لوگ رات کے اندھیارے میں ایک ایک کر کے نقل مکانی کرتے چلے گئے۔ اُنکے اس طرح نقل مکانی کرنے سے باقی بچے اقلیتی فرقے میں خوف و ہراس بڑھتا چلا گیا۔ ہم لوگوں نے بھی نقل مکانی کرنے کا فیصلہ کیا۔ والد صاحب گھر چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھے مگر ہم سب بچے اس بات پہ مصر تھے کہ ہم بھی یہ جگہ چھوڑ کے کہیں اور چلے جائیں جہاں مر مر کر جینا نہ پڑے۔ والد صاحب بڑی منتوں کے بعد راضی تو ہوئے مگر اس شرط کے ساتھ کہ پہلے وہ اپنا سوٹ سری نگر سے لے کر آئیں گے تبھی وہ یہاں سے چلیں گے۔ سری نگر کے حالات ٹھیک نہیں تھے مگر والد صاحب کی ضد تھی کہ وہ سوٹ کے بنا یہاں سے جائیں گے نہیں۔ ہم نے اُنکی ضد کے آگے گھٹنے ٹیک دئے اور اُنہیں سری نگر جانے کی اجازت دی۔

اُنہوں نے ایک دن پہلے غلام نبی درزی تک یہ پیغام پہونچوا دیا تھا کہ اگلے روز اپنا سوٹ لینے آرہے ہیں اسلئے وہ سوٹ سل کے رکھ دیں۔ دوسرے روز وہ سر پر کفن باندھ کر سویرے سویرے گھر سے نکلے اور بس پکڑ کر سری نگر کے لئے روانہ ہوئے۔ اماں پوجا گھر میں بیٹھ کر اُنکی سلامتی کی دعائیں مانگتی رہی۔ یہ وہ پرآشوب دور تھا جب آدمی گھر سے نکلتا تھا تو فاتحہ پڑھ کے نکلتا تھا۔ گھر لوٹنے کی اُمید کم ہی ہاتی تھی۔ ہم بڑی بے چینی سے اُنکے لوٹنے کا انتظار کر رہے تھے۔ والد صاحب جب مہاراجا بازار پہونچ گئے تو اچانک وہاں کھلبلی مچ گئی۔ سب لوگ اپنی اپنی جان بچانے کی خاطر ادھر اُدھر چوہوں کی طرح بھاگنے لگے۔ والد صاحب ہڑبڑا کر غلط سمت کی جانب بھاگنے لگے کہ ایک بھلے مانس نے اُنکو بازو سے پکڑ

کر ایک اندھی گلی کی طرف کھینچ لیا۔ وہ اسی گلی میں جا کر چھپ گئے۔ بہت دیر تک وہ اپنا کلیجہ تھامے سانس روکے بیٹھے رہے۔ اُنہیں گولیاں چلنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ اپنے آپ کو کوس رہے تھے کہ کیوں ایک سوٹ کے لالچ میں اُنہوں نے اپنی جان جوکھم میں ڈال دی۔ ایک گھنٹے تک یہ معرکہ چلتا رہا۔ جب گولہ باری تھم گئی اور لوگ اپنے اپنے بلوں سے باہر آنے لگے تو وہ بھی گرتے پڑتے غلام نبی کی دکان تک پہونچ گئے۔ یہ دیکھ کر وہ سن ہو کر رہ گئے کہ غلام نبی کی لاش اوندھے پڑی تھی اور اُسکے سرہانے کے پاس ہی اُنکا سوٹ پڑا تھا جو خون سے لت پت ہو چکا تھا۔

بوڑھا چنار

میرے گاوں کے بیچوں بیچ جو دیو قامت چنار کا پیڑ جو ایک مستعد سنتری کی طرح ہر دم سینہ تانے کھڑا دکھائی دیتا تھا محض ایک درخت نہیں تھا بلکہ یہ یکجہتی کی علامت تھا، اقدار کا پاسبان تھا، پیار و وفا کا علمبر دار تھا اور تمدن و ثقافت کا امین۔ میں اس چنار کو تب سے جانتا ہوں جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے۔ وہ کب یہاں آیا۔ کون اسے یہاں لگا کے گیا میں نہیں جانتا۔ مجھے تو لگتا ہے جیسے یہ چنار کا پیڑ یہاں صدیوں سے کھڑا ہے۔ میرے باپ کے وقت بھی یہ یہیں پر اپنی جڑیں جمائے کھڑا تھا۔ میرے دادا اور پر دادا کے وقت بھی یہ یہیں پر سر اُٹھائے کھڑا تھا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اسے مغل یہاں لے آئے مگر مجھے تو لگتا ہے جیسے یہ چنار کا پیڑ سورگ سے نکل کر سیدھے یہاں آ گیا ہو۔ اس چنار سے سب پیار کرتے ہیں چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان۔ سکھ ہو یا عیسائی۔ ہر کوئی اسے اپنا سمجھتا ہے۔ یہ بھی کسی سے کوئی بھید بھاو نہیں کرتا۔ اسکے لئے سب ایک سمان ہیں۔ برسوں پہلے میری طرح یہ بھی جوان تھا، تناور تھا۔ اسنے اپنی شاخیں دور دور تک پھیلا کے رکھی تھیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ اسکی جوانی کو بھی میری طرح دیمک لگ گیا اور یہ بھی میری ہی طرح بوڑھا ہونے لگا۔ میں جب بھی اس چنار کے بارے میں سوچتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ مجھ میں اور اس چنار کے درخت میں بڑی مماثلت اور یکسانیت پائی جاتی ہے۔

اس سے پہلے کہ میں آپ کو اس چنار کی روداد سنانے بیٹھ جاوں میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ کل میں پینسٹھ برس کا ہو جاوں گا۔ پچھلی ایک دہائی سے ہر آنے والا جنم دن مجھے بڑھتی عمر کا احساس دلا رہا ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے کوئی میرے کان میں آ کے کہہ رہا ہو کہ چل چلاو کا وقت آ گیا ہے، رخت سفر

باندھ لو۔ زندگی لاکھ تلخ وترش سہی مگر حیات کی اس ردا کو کوئی اپنی رضا سے چھوڑنا نہیں چاہتا۔ موت کتنی بھی مہربان کیوں نہ ہو انسان موت کے نام سے ہی کانپنے لگتا ہے۔ میں بھی اب اپنے بوڑھاپے سے ڈرنے لگا ہوں۔ کہتے ہیں بوڑھاپا سو عیبوں کے برابر ہوتا ہے۔ میں اپنے انت سے اسی طرح سہا ہوا ہوں جس طرح یہ چنار اپنے انجام سے ڈرا ہوا ہے۔

زندگی کتنی تیزی کے ساتھ بھاگتی ہے۔ ایک ہوا کے جھونکے کی طرح ماہ وسال گزر جاتے ہیں۔ میری عمر کے چونسٹھ برس کتنی جلدی گزر گئے۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ کل کی بات ہو۔ یہ عمر مٹھی بھر ریت کی طرح ہوتی ہے جو اُنگلیوں کے پوروں سے کب پھسل کر نکل جاتی ہے پتا ہی نہیں چلتا ہے۔ جب زندگی کی شام ڈھل جاتی ہے اور موت کا سایہ سر پر منڈھلانے لگتا ہے تب پتہ چلتا ہے کہ مٹھی تو کب کی خالی ہو چکی ہے اور موت دروازے پر آ کے کھڑی ہے۔

اپنی ڈھلتی عمر کو دیکھ کر مجھے اپنے گاوں کے اُس چنار کا بار بار خیال آتا ہے جو میری ہی طرح بوڑھا اور لاغر ہو چکا ہے۔ اُسکی ڈالیاں سوکھ چکی ہیں۔ اُسکا تنا کھوکھلا ہو چکا ہے۔ کہیں پر دو چار شاخیں رہ گئی ہیں جن میں اب تک جان باقی ہے۔ یہ چنار بھی میری طرح ہی ڈھیٹ ہے۔ جسم میں دم نہیں، پیروں میں جان نہیں پھر بھی کھڑا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب یہ چنار کا درخت سینہ تانے کھڑا رہتا تھا۔ اُسکی ہر ڈال پتوں سے ایسے ہی لدی پھندی رہتی تھیں جیسے یہ ڈالیاں نہ ہوں کسی نئی نویلی دلہن کی چوڑیوں سے بھری پری بانہیں ہوں۔ آندھی آئے۔ مینہ برسے، بادل گرجیں، بجلیاں کڑکیں، اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ وہ تیز وتند جھکڑ کے تھپیڑے ہنس ہنس کے سہہ لیتا تھا۔ اسکے چھتنار سایے میں کوئی بھی تھکا ماندہ مسافر آ کر بیٹھ جاتا تھا اور اسکے چھاوں میں بیٹھ کر بڑا سکون پاتا تھا۔ سارس کے جھنڈ کے جھنڈ اسے اپنا نشیمن سمجھ لیتے تھے۔ اُنہوں نے ہر ڈال پر گھونسلے بنا کر رکھے تھے۔ نہ اُنکے بیٹ سے یہ نجس ہوتا تھا اور نہ ہی اُنکے شور وغل سے یہ چنار بیزار رہتا تھا۔ اُسنے تو بس ایک ہی نصب العین بنایا تھا کہ وہ اپنی ٹھنڈی چھاوں پھیلاتا رہے گا۔ جو بھی اس کے پلو میں آ کے بیٹھے گا یہ اُس پر اسی طرح سایہ ڈالتا رہے گا۔ خود تیز دھوپ میں بھلے ہی اُسکا اپنا وجود جل جائے پر وہ اس دھوپ سے کے تاپ سے اوروں کو بچالے گا۔

ایک زمانے میں یہ چنار اتنا ہرا بھرا تھا کہ اسکے چھتنار سایہ میں انسان ہی نہیں بارش سے بھیگتے یا دھوپ سے تپتے جانور بھی اسکے سایے تلے پناہ لیتے تھے۔اس کا دامن اتنا وسیع تھا کہ یہ تبر چلانے والے کو بھی اپنے سایے میں پناہ دیتا تھا اور پیار کرنے والے کو بھی۔اسکے سایے تلے کتنی محبتیں پروان چڑھیں۔کتنی داستانیں لکھی گئیں۔اس چنار نے ہر دور دیکھا۔غلامی کا دور۔انقلاب کا دور۔جنگ و جدل کا دور۔ضلم و تشدد کا دور۔اتنے سارے ادوار دیکھنے کے باوجود یہ وہیں کھڑا تھا جہاں اُسکی جڑیں پیوست تھیں۔میری ہی طرح اس نے کافی دکھ اُٹھائے۔اذیتیں برداشت کیں۔جب اپنوں نے اسکے تن سے اسکے انگ کاٹے تو یہ درد سہہ گیا کیونکہ یہ درد اپنوں نے دیا تھا۔میں بھی آدم گزیدہ تھا۔مجھے بھی اپنوں نے ہی بڑے گہرے گھاو دئے تھے۔جب بھی مجھ پر ستم ٹوٹتا تھا تب میں اس چنار کے پاس آکر اسے اپنی بپتا سناتا تھا اور یہ چنار خاموشی سے میرا دکھڑا سنتا تھا۔

جب یہ چنار جوان تھا تب اسی چنار کی طرح میں بھی جوان تھا۔اسے فطرت نے جو ذمہ داری ودیعت کی تھی وہ اسے بخوبی نبھائے جا رہا تھا۔مجھے بھی قدرت نے ایک اہم ذمہ داری سونپی تھی۔میرے کاندھوں پر گھر بھر کا بوجھ تھا۔بھرا پرا گھر تھا ہمارا۔چھوٹے بڑے ملا کر ہم ایک ہی گھر میں سات لوگ رہا کرتے تھے۔ایک میرے تاو جی تھے جنہوں نے شادی نہیں کی تھی۔اچھا ہی کیا تھا اُنہوں نے کہ وہ برہمچاری ہی رہے تھے۔اُن کا مزاج بڑا غصیلا تھا، بات بات پر وہ اُبل پڑتے تھے۔تحمل کا اُن میں یارانہ تھا۔ذراسی بات اُن سے اُٹھائی نہیں جاتی تھی۔اُنکی اس غصیلی طبعیت کی وجہ سے اُنکا نام تتا تواپڑ گیا تھا۔ایک میری بوا تھی جو بیوگی کی زندگی گزار رہی تھی۔بھری جوانی میں اُنکے شوہر کا انتقال ہوا تھا۔سسرال والوں نے اُسے منحوس سمجھ کر گھر سے نکال دیا۔وہ پھر سے میکے لوٹ کر آئی تھی۔جب سے وہ یہیں اپنے میکے میں پڑی تھی۔ایک میرے ماں باپ تھے۔دونوں ظعیف ہو چکے تھے۔ماں تو دائمی مرض میں مبتلا تھی۔وہ آٹھوں پہر کھاٹ پر ہی پڑی رہتی تھی۔اسکے علاوہ میری دو بہنیں تھیں جو کہ جوان تھیں پر اُنکی شادی میں ماں کی بیماری کے کارن تاخیر ہو رہی تھی۔ایک دن تاو جی نے فیصلہ لیا کہ اُنکی شادی کردی جائے اور ساتھ ہی مجھے بھی ٹھکانے لگا دیا جائے۔بابو جی اتنی چھوٹی عمر میں میری شادی کرانے کے حق میں

نہ تھے مگر تاوجی کا ہر فیصلہ اُنکے لئے حکم الٰہی کی طرح ہوتا تھا۔ ماں کی بیماری کے سبب مجھے کچی عمر میں ہی شادی کرنی پڑی۔ عمر کچی تھی مگر میری سوچ پختہ تھی۔ مجھے اپنی ذمہ داریوں کا احساس کچی عمر میں ہی ہو چکا تھا۔ ہمارے پاس اچھی خاصی زمین جائیداد تھی جسکی دیکھ بھال کا ذمہ میں نے لے لیا تھا۔ میں نے اپنے پریوار کو ہر سکھ دینے کی مقدور بھر کوشش کی جس میں میں کسی حد تک کامیاب بھی رہا۔ ماں اور بابو جی میرے کام کاج کو دیکھ کر پھولے نہیں سماتے تھے۔ دراصل وقت سب سے بڑا اتالیق اور رہنما ہوتا ہے اور حالات انسان کو جینے کے سبھی رنگ ڈھنگ سکھا دیتے ہیں۔

میری بیوی نے میرا پورا ساتھ دیا۔ بیاہ کے وقت اُسکی عمر محض تیرہ سال کی تھی مگر وہ فہم وادراک سے تیس سال کی لگتی تھی۔ کس کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہے یہ جیسے وہ ماں کی کوکھ میں ہی سیکھ کر آئی تھی۔ اُسنے میرے گھر کو اس خوبصورتی اور قرینے سے سجایا کہ جو بھی ہمارے گھر آتا تھا وہ اس چھوٹی سی دلہن کا نظام دیکھ کر دنگ رہ جاتا تھا۔ اُسنے میرے گھر کو اپنے نازک ہاتھوں سے سچ مچ کا سورگ بنا ڈالا۔ میں اپنی قسمت پر فرحاں و نازاں تھا۔ میری بیوی لتا نے میری زندگی کے مشکل سفر کو اپنی سوجھ بوجھ سے آسان بنا دیا تھا۔

سال در سال چنار کی کچھ شاخیں کاٹ کے اُنکی شجر کاری کی جاتی تھی۔ جس طرح میں اپنا پریوار بڑھا رہا تھا اسی طرح یہ چنار بھی اپنا پریوار بڑھائے جا رہا تھا تیس کے پڑاو تک پہونچتے پہونچتے میں دو بیٹوں کا باپ بن چکا تھا۔ بچوں کے آنے سے گھر میں بہار آ گئی تھی۔ میری ماں جو دائمی مرض میں مبتلا تھی پوتوں کو دیکھ کر اُسکی آدھی بیماری دور ہو گئی تھی۔ اب اُسنے بستر چھوڑ دیا تھا اور اپنے پوتوں کو کھلانے پلانے اور لاڈ کرنے میں دن بھر مشغول رہتی تھی۔ ہرے بھرے چنار کی طرح میرا گھر بھی خوشیوں اور شادمانیوں سے بھر گیا تھا۔ میں اکثر اس سایہ افگن چنار کی چھاوں میں بیٹھ کر اپنی ساری تکان بھول جاتا تھا۔ یہ چنار مجھ میں ایک نیا ولولہ، ایک نیا جوش اور تازگی بھر دیتا تھا۔

خوشیوں کا یہ قافلہ زیادہ دنوں تک میرے ساتھ نہیں چلا۔ پہلے اماں کا دیہانت ہوا۔ اُسکے فوراً بعد بابو جی بھی ساتھ چھوڑ گئے۔ میں نے اپنا سر تاوجی کے کاندھے پر رکھ دیا تھا۔ اب تو وہی ایک

سہارا بچا تھا۔ ایک دن یہ کاندھا بھی ڈھیلا پڑ گیا۔ اب بزرگوں میں بس ایک بوا ہی رہ گئی تھی۔ اُسکا ہونا، نہ ہونا ایک جیسا تھا۔ وہ گھر کے کسی معاملے میں دخل نہیں دیتی تھی۔ اُسنے تو سنسار سے جوگ لیا تھا اور ایک جوگن کی طرح وہ صبح سے شام تک مراقبے میں رہتی تھی۔ اب تو میں ہی گھر کا بڑا بزرگ تھا۔ جو بھی فیصلہ لینا ہوتا تھا وہ میں اکیلے ہی لیتا تھا۔ وقت ہی میرا رہبر اور رہنما تھا۔ وہی میری رہنمائی کرتا تھا۔

میں نے دن رات محنت و مشقت کی۔ میں نے اپنے بچوں کو کسی چیز کی کمی محسوس ہونے نہ دی۔ ہم نے بچوں کے بڑے ناز ونعم سے پالا۔ وہ جس چیز کی فرمائش کرتے تھے میں لاکر رکھ دیتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بچے بڑے ہو گئے۔ دونوں بچوں نے اچھی تعلیم حاصل کی۔ اُن دنوں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد بہت کم ہوا کرتی تھی اسلئے میرے بچوں کو بغیر کسی تگ و دو کے اچھی نوکریاں مل گئیں۔ نوکری ملنے کی دیر تھی کہ دونوں کے لئے ایک سے بڑھکر ایک رشتے آنے لگے۔ میں اپنے فرض سے بہت جلد دستبردار ہونا چاہتا تھا اسلئے میں نے اپنی بیوی سے مشورہ کر کے دو لڑکیاں پسند کیں۔ دونوں کھاتے پیتے گھرانوں کی تھیں۔ اچھی پڑھی لکھی بھی تھیں۔ چونکہ ہم خاندانی رئیس تھے اسلئے ہمارے ہاں کہنے کی دیر تھی کہ اُنکے لئے بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ میں نے دونوں کی شادی دھوم دھام سے کر دی۔ پورے گاؤں نے شادی کی اس تقریب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ایک ہفتے تک مہمانوں کا سلسلہ تھما نہیں۔ ایک ہفتے کے بعد سارے رشتہ دار اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔

شروع شروع میں بہوئیں میرے سامنے گھونگھٹ نکال کر آیا کرتی تھیں۔ کچھ ہی ہفتے گزر گئے کہ گھونگھٹ ہٹ گیا اور وہ بنا گھونگھٹ کے ادھر اُدھر گھومنے لگیں۔ میں نے اپنی بیوی سے اس بات کی شکایت کی تو اُس نے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''آپ کب تک لکیر کے فقیر بنے رہیں گے۔ زمانہ بدل چکا ہے۔ میں ان پڑھ تھی، غریب گھر کی تھی اسلئے میں بڑوں کے مان سمان کا خاص خیال رکھتی تھی۔ بنا گھونگھٹ کے میں گھر کے کسی بھی بزرگ کے سامنے نہیں جاتی تھی۔ یہ تو پڑھی لکھی لڑکیاں ہیں۔ یہ ان باتوں کو فرسودہ قرار دیتی ہیں۔ آپ انہیں اپنی زندگی اپنی مرضی سے جی لینے دیجئے۔ اس طرح گھر میں شانتی بنی رہے گی نہیں تو ہر روز گھر

میں کسی نہ کسی بات کو لے کے ٹکراو پیدا ہوگا جو کہ اچھا شگون نہیں ہے''

میری بیوی کی باتیں کسی حد تک سہی بھی تھیں۔ میں ابھی تک ماضی میں ہی جی رہا تھا جب کہ وقت بہت آگے نکل چکا تھا۔ وہ اپنی من مرضی چلاتے رہے اور میں ایک تماشائی بن کر کھڑا رہا۔

ایک دن مجھ سے بہت بڑی بھول ہوگئی۔ بڑی بہو نیند سے جب اُٹھی تو صبح کے نو بج چکے تھے۔ لتا نے نہ صرف ہم سب کو ناشتہ کرایا تھا بلکہ دن کا کھانا بھی تیار کیا تھا۔ میں نے کچھ اونچے سر میں اپنی بڑی بہو سے کہا۔

''بڑے شرم کی بات ہے۔ تمہاری ساس صبح چار بجے اُٹھ جاتی ہے اور تم نو بجے بیدار ہو جاتی ہو۔ یہ مت بھولو بہو، یہ تمہاری ساس ہے گھر کی نوکرانی نہیں۔ گھر میں رہنا ہے تو گھر کے قاعدے قانون کا پالن کرنا سیکھو۔ خود نہیں پکا سکتی کم سے کم اپنی ساس کا ہاتھ تو بٹاو۔ آخر کھانا تو ہم سب کھاتے ہیں۔ اسلئے ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم سب مل جل کر اس گھر کو چلائیں''

میری بات بڑی بہو کے کلیجے میں تیر کی طرح چبھی۔ وہ کچھ بولی نہیں، اُٹھ کے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اندر اُسنے اپنے شوہر سے کیا شکایت کی یہ تو وہی جانے مگر پہلی بار ایسا ہوا جب میرا بڑا بیٹا کچھ کھائے پئے بنا دفتر چلا گیا۔ دن بھر اُسکی ماں ماہی بت آب کی طرح تڑپتی رہی۔ شام کو وہ جب گھر لوٹا تو ماں کی جان میں جان آگئی۔ سب سے پہلے اُسنے اُسے شکایت بھرے لہجے میں ڈانٹا۔

''آخر ایسی کیا بات ہوئی جو تم کچھ کھائے بنا دفتر چلے گئے۔ تمہارے بابو جی نے اگر تمہاری بیوی کو ڈانٹا تو بھلے کے لئے ہی ڈانٹا نا۔ جو پیار کرتے ہیں وہی ڈانٹا بھی کرتے ہیں۔ یہ مت بھولو کہ یہ وہی بابو جی ہیں جنہوں نے اپنا سکھ اور آرام تیاگ کر تم لوگوں کی پرورش کی۔ سائبان بن کر تم لوگوں پر سایہ کیا تا کہ تم پر حالات کی دھوپ نہ پڑ جائے۔ آج وہی بابو جی اتنے برے ہوگئے کہ تمہاری بیوی کو زرا سا کیا ڈانٹا تم نے ہم کو اتنی بڑی سزا دی۔ تم کیا جانو کہ میں دن بھر کیسے تڑپتی رہی۔ میرا قصور یہی ہے نا کہ میں تم سب سے بہت پیار کرتی ہوں۔ بیٹے ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کو دل پر لوگے تو نہ خود چین سے جی پاوگے، نہ ہمیں سکون سے جینے دوگے اسلئے آگے سے اس بات کا دھیان رکھنا کہ زرا سی چنگاری گھر کو آگ

لگا سکتی ہے"

میرے بچے ماں سے بہت پیار کرتے تھے اسلئے اُس نے ماں کے ساتھ کسی قسم کی حجت نہ کی۔ چپ چاپ اُسکی باتیں سنتا رہا اور پھر ماں کو تسلی دیکر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ شام کو ہم سب نے مل کر کھانا کھایا۔ صبح والی بات پر کسی قسم کا تزکرہ نہیں ہوا۔ ایسا ماحول تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ میرے بچے بھی مجھ سے اُسی طرح پیش آئے جیسے اُنہیں مجھ سے کوئی ملال نہ ہو۔ میں نے دل ہی دل میں کہا چلو اللہ اللہ خیر صلا۔

کئی مہینے گزر گئے۔ بوڑھے چنار کو لے کر بڑا تنازعہ شروع ہوگیا۔ اُسکی جڑیں اب اتنی کمزور ہو چکی تھیں کہ اسکے گرنے کا خدشہ پیدا ہوا تھا۔ طے یہ ہوا تھا کہ اب اس چنار کو کاٹ لیا جائے۔ مسلمانوں نے کہا اس چنار پر سب سے پہلے اُن کا حق بنتا ہے اسلئے اسکی لکڑی وہ لے کر جائیں گے کیونکہ مسجد میں جو حمام تھا اُسے گرم رکھنے کے لئے اُنہیں سردیوں میں لکڑی کی ضرورت پڑتی تھی۔ ہندوں کا کہنا تھا کہ وہ کشمیر کے موروثی باشندے ہیں اسلئے اس چنار کی لکڑی پر پہلا حق اُنکا ہے کیونکہ چتا کو جلانے کے لئے اُنہیں بازار سے لکڑی خریدنی پڑتی ہے۔ اب اس بات کو لیکر دونوں فرقوں میں تلواریں کھیچ گئیں۔ کوئی بھی پیچھے ہٹنے کے لئے تیار نہ تھا۔ آخر بڑے بزرگ بیچ میں پڑ گئے اور اُنہوں نے یہ فیصلہ لیا کہ جتنی بھی لکڑی ہوگی وہ دونوں فرقوں میں آدھی آدھی بانٹی جائے گی۔

ادھر چنار کا بٹوارہ ہوا اُدھر میرے بچے ایک دن میرے پاس آئے اور اپنی ماں کی موجودگی میں مجھ کو سمجھاتے ہوئے بولے۔

"آپ نے دیکھا گاوں کے چنار کو لیکر کتنا بڑا بکھیڑا کھڑا ہو گیا۔ ہم دونوں بھائی نہیں چاہتے کہ کل اس جائیداد کو لے ہم بھائیوں میں بھی سر پھٹول ہو اسلئے ہم آپ کو یہ سمجھانے آئے ہیں کہ آپ اپنی حیاتی میں ہی جائیداد کا بٹوارہ کیجئے۔"

بٹوارے کے نام سے ہی میرے سینے پر جیسے ایک وزنی گھونسہ پڑا۔ مجھے لگا جیسے میری زندگی کے دن پورے ہو چکے ہیں۔ میں شاید اُنکی اس تجویز کو سرے سے ہی ٹھکرا دیتا مگر اُنہوں نے ماں کو

پہلے سے ہی اپنے حق میں ہموار کیا تھا اسلئے وہ بھی اس بات کی تائید میں کھڑی ہوگئی۔ وہ مجھے سمجھاتے ہوئے بولی۔

''ہم نے جیسے تیسے کر کے اپنی زندگی کے دن پورے کر لئے۔ اب ہم اس جائیداد کو اپنے پاس رکھ کر کیا کریں گے۔ یہ جائیداد تو ان ہی کی ہے۔ ہمارے جیتے جی ہی بٹوارہ ہو جائے تو ہم بھی ساری چنتاوں سے مکت ہو جائیں گے۔ آگے یہ اس جائیداد کو جسطرح استمال کرنا چاہئیں یہ انکی مرضی۔ ہم جتنی جلدی اس ذمہ داری سے دستبردار ہو جائیں گے اُتنا ہی یہ ہم سب کے لئے اچھا ہے۔''

مجھے اپنی بیوی کے فیصلے سے صاد کرنا پڑا کیونکہ جتنا حقدار میں اس جائیداد کا تھا اُتنی ہی حقدار وہ بھی تھی۔ مجھے جھٹکا تو اُسوقت لگا جب اُنہوں نے میرے سامنے بٹوارے کے کاغذات رکھ لئے۔ یعنی یہ پلان پہلے سے اُنکے دماغ میں تھا اور دونوں بھائی اس معاملے میں ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ اصل میں اس ساری کارستانی کے پیچھے درپردہ اُنکی بیویوں کا شاطر دماغ کام کر رہا تھا۔ دونوں کا لگ رہا تھا کہ کہیں وہ ایک کو کم اور دوسرے کو کچھ زیادہ نہ دے دے۔ ہمارے پاس کافی جائیداد تھی اسلئے دونوں بہوئیں برابر برابر کا حصہ پانا چاہتی تھیں۔ میں نے بیوی کے اصرار پر کاغذات پر دستخط کر لئے۔ دونوں خوش ہوئے اور ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئے جیسے اُنہوں نے بہت بڑی جیت حاصل کی تھی۔

اُدھر چنار کا ٹکڑے ٹکڑے ہوئے تھے اِدھر میرے بھی ٹکڑے ہوئے تھے۔ میں اس زعم میں تھا کہ جب تک ہم لوگ حیات ہیں، ہم سب مل جل کر رہیں گے مگر بہت جلد میرے دل کو بہت گہرا دھچکا لگا جب ان دونوں بھائیوں نے اپنے اپنے چولھے الگ کر دئے۔ میں نے دونوں کو بلا کر پوچھا۔

''تم لوگوں نے اپنے اپنے چولھے الگ کر دئے۔ ہم کہاں رہیں گے؟''

بڑا بیٹا بڑی ڈھٹائی سے بولا۔

''اسمیں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ ماں میرے ساتھ رہے گی، آپ نٹو کے ساتھ رہیں گے''

اس جواب سے میرا کلیجہ ریزہ ریزہ ہو کر رہ گیا۔ میں نے من مسوس کر اُس

سے پوچھا۔

''تو اس کا مطلب ہے کہ تم لوگوں نے ہمارا بھی بٹوارہ کر دیا؟''

وہ کچھ نہ بولے۔ اُٹھ کر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ میں نے آبدیدہ ہو کر لتا سے کہا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے۔ جن بچوں کے لئے ہم نے اپنی ساری زندگی نچھاور کر دی اب ہم اُنکے لئے ہی بوجھ بن گئے؟''

''آپ نے کسی پیڑ کو اپنا پھل چکھتے ہوئے کبھی دیکھا ہے۔ پیڑ پھل پیدا کرتا ہے اور وہ پھل دوسرے کھا لیتے ہیں۔ ہم نے بھی بچے پیدا کئے۔ اُنہیں پال پوس کر بڑا کیا۔ اُنہیں آباد کیا۔ ہمارا کام پورا ہوا۔ اب یہ پھل ہمارے کام کا نہیں ہے۔ اب اس پھل کا آنند کوئی اور اُٹھا لے گا۔ ہمارا کیا ہے۔ اب جتنے دن بچے ہیں وہ ہم جیسے تیسے کر کے نکال لیں گے۔''

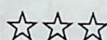
میں کبھی نہیں رویا۔ جب میری زندگی میں ایک کے بعد ایک افتاد پڑی تب بھی میں نہیں رویا مگر اُس دن میں اپنے آنسو روک نہیں سکا۔ میں ایک بچے کیطرح بلک بلک کے رویا۔ آخر یہ وقت کو ہو کیا گیا۔ کیا چنار کے ڈھیر ہوتے ہی ساری قدریں بدل گئیں؟ کیا رشتوں کا جو پاسدار تھا اُسکے جاتے ہی رشتوں کے معنی بدل گئے۔ انسان کبھی اتنا خود غرض نہیں تھا جتنا وہ آج کے حالات میں بن چکا ہے۔ بے رحم ،سفاک اور کمینہ۔ لتا بھی رونا چاہتی تھی مگر میری خاطر وہ اپنے آنسو ضبط کئے بیٹھی تھی۔ آج میرے بچوں نے ہمارے جگر پر چھری چلائی تھی۔ بڑی بے رحمی سے اُنہوں نے ہمارے جذبات کا خون کر ڈالا تھا۔

چنار بٹ چکا تھا۔ آدھا مسجد کے احاطے میں پہونچ چکا تھا آدھا شمشان گھاٹ پر۔ ہم میاں بیوی بھی دو ٹکڑوں میں بٹ چکے تھے۔ میں سات نفری پریوار کو اکیلے پالنے کا مادہ رکھتا تھا۔ میرے بچے اپنے ماں باپ کو پال نہ سکے۔ کتنا بڑا المیہ ہے یہ۔ کتنی بڑی ستم ظریفی ہے یہ۔ میں نے لتا پر پہلی بار اپنی بھڑاس نکالی۔

''تم نے بچوں کو نہیں سنپولوں کو جنم دیا تھا۔ تم نے ہی میرے ہاتھ کاٹ ڈالے۔ مجھے

اپنی جائیداد سے بے دخل ہونے پر تم نے ہی مجھے مجبور کیا۔ تم کو لگتا تھا کہ تمہارے بچے شرون کمار ہیں جو ساری زندگی تمہارے پاوں پاوں دھودھو کر پئیں گے۔ وہ زمانہ لد گیا جب بچے ماں باپ کے قدموں میں جنت ڈھونڈتے تھے۔ آج وہ ماں باپ کو اُسی بوڑھے چنار کی طرح سمجھنے لگے ہیں جو نہ جانے کب اُن پر جا کر گرے۔ میں چاہوں تو آج بھی انہیں سڑک پر لا سکتا ہوں مگر میں ان کی طرح اتنا نیچ نہیں بن جاوں گا۔ پھر ان میں اور مجھ میں فرق ہی کیا رہے گا۔ چل اپنا سامان باندھ لیں۔ اب ہم اس گھر میں ٹکڑوں میں بٹ کے نہیں جئیں گے۔ یہ دنیا بہت بڑی ہے کہیں نہ کہیں ہمیں آسرا مل جائے گا۔ انسانیت ابھی بھی زندہ ہے۔ آدمیت ابھی ختم نہیں ہوئی''

ہم نے اپنا سامان باندھ لیا اور گھر سے کسی سے کچھ کہے سنے بنا نکل گئے۔ میں نے اُس بوڑھے چنار کی لاش کے آخری دیدار کیئے اور ہم دونوں ایک نامعلوم منزل کی اور چل پڑے۔



دل آگیا گوری پر

اس سے پہلے کہ سوکھے دانوں پانی پڑتا قادر مغل کی زندگی ہی چوپٹ ہو کر رہ گئی۔ اُسکی بیوی شمینہ نے قادر مغل کا گھر چھوڑ دیا اور اپنے چار بچوں کو ساتھ لے کر وہ میکے چلی گئی۔

قادر مغل تن و توش کا آدمی نہیں تھا۔ وہ سوکھے بانس کی طرح ایکدم کھوکھلا اور چھریرا تھا۔ اپنے اس دبلے پتلے بدن کو رنگ بہ رنگی کپڑوں سے ڈھانپنے کے باوجود وہ سوکھا مریل ہی لگتا تھا۔ باہر سے وہ چاہے جیسے بھی دکھتا تھا مگر اندر سے بڑا ہی سخت، سفاک اور بے رحم آدمی تھا۔ شمینہ دس سال سے اُسکے ظلم و ستم کا شکار بنی رہی، پر دنیا داری کے ڈر سے وہ چپ چاپ اپنے شوہر کے مظالم سہتی جا رہی تھی۔ اُسے سماج سے کہیں زیادہ اپنے بچوں کی پرواہ تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اُسکے بچے دھوبی کے کتے کی طرح نہ گھر کے رہیں نہ گھاٹ کے اسلئے نہ چاہ کر بھی وہ زہر کے گھونٹ پیتی رہتی تھی۔ قادر مغل فطرت سے بڑا خسیس اور سڑا ہوا آدمی تھا۔ وہ اپنی بیوی سے جتنی شدید نفرت کرتا تھا اپنے بچوں سے اُتنا ہی شدت سے پیار کرتا تھا۔

قادر مغل کا اپنا ایک ہاوس بوٹ تھا جس کا نام سن رائز ہاوس بوٹ تھا۔ ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب کہ قادر مغل کا ہاوس بوٹ سال کے آٹھ مہینے سیاحوں سے بھرا رہتا تھا۔ اُن دنوں قادر مغل کے گھر میں ہن برستا تھا۔ کیا ٹھاٹ تھے اُسکے۔ وہ جب بھی لال چوک کی طرف نکلتا تھا تو کسی صاحب سے کم نہیں لگتا تھا۔ اُسے دکھاوے کا بڑا شوق تھا۔ وہ اپنے حریفوں کا جلانے کے لئے سوٹ بوٹ پہن کے نکلتا

تھا۔لال چوک پہونچ کر وہ لبہ کول کے بار میں گھس کر ایک دو پیگ مار لیتا تھا اور پھر بچوں کے لئے ڈھیر سارے کھلونے لے کر گھر لوٹتا تھا۔تب اُسے شمینہ کسی حور سے کم نہیں لگتی تھی۔شمینہ کے خاندان والے بھی پیشے سے ہانجی تھے۔ماں باپ برسوں پہلے گزر چکے تھے میکے میں ایک بھائی تھا جس کا نام علی محمد چاپری تھا۔وہ بھی ہاوس بوٹ کے پیشے سے ہی منسلک تھا۔علی چاپری بڑا ہی شریف اور نیک بندہ تھا۔نہ کسی کے لینے میں نہ دینے میں۔بس وہ اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔اپنی چھوٹی بہن شمینہ کے لئے تو وہ ہر دم اپنی جان نچھاور کرنے کے لئے تیار رہتا تھا۔وہ اپنی چھوٹی بہن کو اپنی جان سے بھی زیادہ چاہتا تھا۔اُسکی وجہ یہ تھی کہ باپ کے مرنے کے بعد اُسنے شمینہ کو اپنی اولاد کی طرح پالا تھا اسلئے وہ اُسکی ناک پر مکھی تک بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔وہ جب بھی بہن سے ملنے آتا تھا تو کبھی خالی ہاتھ نہیں آتا تھا۔کبھی بچوں کے لئے کھلونے لے کے آتا تو کبھی بہن کے لئے قیمتی پوشاکیں۔بہن منع کرتی پھر بھی وہ کچھ نہ کچھ لے کے ہی آجاتا تھا۔وہ اپنی بہن کے سسرال میں کچھ کھاتا پیتا نہیں تھا۔بہن قسمیں دیتی تھیں تو اُسکا دل رکھنے کے لئے کبھی ایک کپ چائے پی لیتا تھا۔اُس سے زیادہ کچھ نہیں۔جب تک علی چاپری کا دھندہ چلتا رہا تب تک وہ قادر مغل کی آنکھوں کا تارا بنا رہا۔جونہی کشمیر کے حالات بگڑ گئے ،وادی میں بندوقیں دندنانے لگیں تو ٹورسٹوں نے کشمیر کا رخ کرنا ہی چھوڑ دیا۔جس ڈل جھیل میں سیاحوں کی آمد سے رونق آجاتی تھی۔ہر طرف کشتیاں لہراتی نظر آتی تھیں اب وہی ڈل جھیل ویران نظر آرہا تھا۔ڈل کے پانیوں پہ ہاوس بوٹ ایسے کھڑے دکھائی دیتے تھے جیسے سب مل کر اپنی بربادی کا سوگ منا رہے ہوں۔کشتیاں گھاٹ سے لگی لگی تھک چکی تھیں۔ہر سو ہو کا عالم تھا۔شام ہوتے ہی یہ خوبصورت شہر،شہر خموشاں میں تبدیل ہو جاتا تھا۔نہ کوئی آدم نہ آدم زاد دکھائی دیتا تھا۔وہ دن تو اب قصہ پارینہ بن چکے تھے جب آدھی رات تک گھاٹوں پر چہل پہل رہا کرتی تھی۔سب کچھ بدل چکا تھا اور ہانجیوں کی طرح علی چاپری کا بھی دھندہ ٹھپ ہو گیا تھا۔اب تو ایک بھی ٹورسٹ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔اب اگر اتفاق سے کوئی ٹورسٹ مل جاتا تھا تو ہاوس بوٹ مالک اُس پر یوں ٹوٹ پڑتے تھے جیسے کسی مردار جانور پر گدھ ٹوٹ پڑتے ہیں۔آپسمیں ہاتھا پائی ہو جاتی تھی۔لاٹھیاں اور ڈنڈے چلنے لگتے تھے۔لوگ ایک دوسرے کے کپڑے پھاڑتے تھے۔آخر

بازی وہ مار جاتا تھا جسمیں لڑنے کا مادہ ہوتا تھا۔ جو لڑ نہیں پاتے تھے وہ بالآخر اپنی ہار تسلیم کرتے تھے۔

ایسے حالات میں اب علی چاپری جب بھی اپنی بہن سے ملنے آتا تھا تو خالی ہاتھ ہی آتا تھا۔ خود تو روٹی کے لالے پڑے تھے ایسے میں وہ اوروں کی کیا دستگیری کر پاتا۔ بے کاری کے سبب قادر مغل بڑا چڑ چڑا ہو گیا تھا۔ زرا زرا سی بات پر وہ اُبلنے لگتا تھا۔ جس علی چاپری کو دیکھ کر اُسکی آنکھیں روشن ہو جایا کرتی تھیں اب اُسے دیکھ کے وہ یوں ناک بھوں چڑھا لیتا تھا جیسے وہ اُس سے قرض وصول کرنے آیا ہو۔ علی چاپری چونکہ اپنی بہن سے بہت پیار کرتا تھا پھر بھی وہ قادر مغل کی ناگواری کو نظر انداز کر کے بہن کی خیر خبر پوچھنے ہفتے عشرے میں ایک بار ضرور آجایا کرتا تھا۔

شمینہ بڑی خوددار عورت تھی۔ وہ اپنے بھائی کی زلت برداشت نہیں کر سکتی تھی اسلیئے اُس نے ایک دن دوٹوک لہجے میں اپنے بھائی سے کہہ دیا کہ وہ اُس سے ملنے نہ آیا کرے کیونکہ اُسکے شوہر کو اُسکا یہاں آنا گوارہ نہیں ہے۔ بہن کے منہ سے یہ بات سن کر علی چاپری کو اچنبھا ہی نہیں ہوا بلکہ دل کو بڑی گہری ٹھیس بھی لگی۔ وہ جیسے تیسے کر کے اپنا گھر چلا رہا تھا۔ اُسنے اپنے بہنوئی سے کبھی ایک پیسے کی مدد نہیں مانگی۔ وہ قادر مغل کے اس اچانک بدلاو سے حیران بھی تھا اور پریشان بھی۔ آخر ایک دن اُسکی ناگواری اُسکی سمجھ میں آگئی۔ اُسے یہ وہم ہو گیا تھا کہ شمینہ پس پردہ اپنے بھائی کی مالی اعانت کرتی ہے۔

اسی بیچ قادر مغل کے ہاوس بوٹ میں ایک میم آکے ٹھہری۔ سوکھے دانوں پانی پڑا۔ قادر مغل کو لگا جیسے اُسکے ہاتھ کوہ نور ہیرا لگا ہو۔ وہ اسے خوش رکھنے کے لئے رات دن اُسکی خاطر داری میں لگا رہتا تھا۔ وہ اگر آسمان کے تارے توڑ کر لانے کو کہتی تو قادر مغل ناممکن کو ممکن بنانے کی سعی سے گریز نہ کرتا۔ اس میم کا نام پامیلا تھا جو کہ لنڈن سے آئی تھی اور قادر مغل کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔ وہ اتنی خاموشی اور رازداری کے ساتھ اُسے اپنے ہاوس بوٹ تک لے آیا تھا کہ اسکی آمد کی خبر فرشتوں کو بھی لگنے نہ دی۔ اُسے یہ ڈر تھا کہ کہیں اگر کسی اور ہاوس بوٹ والے نے اُسے پھسلا لیا تو وہ ہاتھ ملتا رہ جائے گا۔ پامیلا کھلی ڈھلی عورت تھی۔ وہ بیحد خوبصورت تھی اور قادر مغل کے ساتھ ایسے پیش آتی تھی جیسے وہ اُسکا خصم ہو۔ اُسکی قربت

سے قادر مغل کے برتاو میں ڈرامائی بدلاو آ گیا۔ اُسکے اس اچانک بدلے ہوئے رویے سے ثمینہ حیران تھی۔ وہ بہانے بہانے سے ثمینہ کو ذلیل کرتا رہتا تھا۔ کبھی اُس پر چوری چھپے بھائی کی مدد کرنے کا الزام لگا تا تو کبھی اُسکے ہر کام میں مین میخ نکال کر اُسے خون کے آنسو رلاتا تھا۔ اُسے تو ثمینہ سے چڑ ہونے لگی تھی۔ آج تک اُسنے اپنے بچوں کو پھولوں کی چھڑی تک نہیں لگائی تھی اب وہ اُنہیں زرا سی بات پر مارتا پیٹتا تھا۔ ثمینہ جونہی کہیں نکل جاتی تھی تو وہ پامیلا کے پاس بیٹھ کر اُسکی دلجوئی میں لگا رہتا تھا۔ ساتھ ہی وہ اپنی بیوی کی برائی کرتا رہتا اور پامیلا کے سامنے اپنے آپ کو مظلوم اور لاچار ظاہر کرتا رہتا تھا۔ روز روز اپنا جھینکا سناتے سناتے دھیرے دھیرے پامیلا کے دل میں اُسکے لئے ہمدردی پیدا ہوگئی اور وہ اُسے تسلی دیتی، اُسکی ایسے دلجوئی کرتی جیسے وہ واقعی مظلوم اور ستم رسیدہ ہو۔

پہلے تو وہ ثمینہ پر باتوں کے زہریلے نشتر چلاتا تھا۔ اب تو وہ اس حد تک گر گیا تھا کہ وہ اُسے سب کے سامنے مارتا پیٹتا بھی تھا۔ بیچاری ثمینہ بچوں کی خاطر قادر مغل کے سارے ظلم وستم سہتی رہی لیکن جب پانی سر سے اونچا ہو گیا تو ایک دن اُسنے قادر مغل کا گھر چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اپنے بچوں کو لیکر اپنے میکے چلی گئی۔ علی چاپری نے جب اپنی بہن کی بپتا سنی تو اُسکا خون کھول اُٹھا۔ وہ اگلے روز قادر مغل سے ملنے گیا۔ قادر مغل تو پہلے سے ہی بھرا ہوا بیٹھا تھا۔ وہ علی چاپری سے بات کرنے کو بھی تیار نہ تھا لیکن جب علی چاپری سر پڑ گیا تو وہ اُسکی بات سننے پر مجبور ہوا۔ چاپری نے قدرے خفگی سے پوچھا۔

''آخر میری بہن سے ایسا کیا گناہ سرزد ہوا جو تم نے اُسے گھر سے باہر نکال دیا۔''

''میں نے اُسے گھر سے نکال دیا؟'' وہ بپھر کے بولا۔ ''جھوٹ بک رہی ہے وہ۔ میں نے اُسے گھر سے نہیں نکال دیا بلکہ وہ خود یہ گھر چھوڑ کے چلی گئی۔ تمہیں میری بات کا یقین نہیں تو میرے ہاوس بوٹ میں ٹھہری اس میم سے پوچھو۔ میں نے اُسے روکنے کی بہت کوشش کی مگر وہ تو جیسے یہ طے کر کے بیٹھی تھی کہ اُسے یہاں سے جانا ہے۔ کیا پتا کہ اُسنے کوئی اور خصم ڈھونڈ لیا ہو۔''

علی چاپری کا خون کھول اُٹھا مگر وہ یہ سوچ کر خون کے گھونٹ پی کے رہ گیا کہ چھری تربوزے پر گرے یا تربوزہ چھری پر نقصان تو تربوزے کا ہی ہوگا۔ قادر مغل کا کیا ہے۔ وہ کل کسی اور سے

نکاح کر لے گا اور اُسکی بہن کو یونہی لٹکا کے رکھے گا اسلئے اُسنے اپنے بہنوئی سے حجت کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ اُسکے سامنے ہاتھ جوڑ کر بولا۔

''اب اگر میری بہن سے غلطی ہوئی ہے تو اُسکی طرف سے میں تم سے معافی مانگ لیتا ہوں۔ اُسکا نہ سہی کم سے کم اپنے بچوں کا تو کچھ خیال کرو۔ تم لوگوں کے جھگڑے ٹنٹے میں اُنکی زندگی تباہ ہوجائے گی۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اُنکی زندگی غارت ہوجائے''

قادر مغل غضب ناک آنکھوں سے علی چاپری کی طرف دیکھ کر بولا۔

''علی چاپری میری بات کان کھول کے سن لو۔ اب میں تمہاری بہن کے ساتھ ایک پل بھی رہ نہیں سکتا۔ جب تک میں اُسے عیش و آرام کی زندگی دیتا رہا تب تک میں اچھا تھا۔ اب دھندہ چوپٹ ہوگیا تو میں برا ہوگیا۔ کہنے والے سچ ہی کہہ گئے ہیں کہ جب برا وقت آتا ہے تو اپنا سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ تمہاری بہن میری طرف سے آزاد ہے۔ وہ جب چاہے مجھ سے طلاق لے سکتی ہے یا مجھے خلع دے سکتی ہے۔ رہی بچوں کی بات تو وہ بعد میں طے کرلیں گے کہ بچے کس کے ساتھ رہیں گے۔''

علی چاپری قادر مغل کے اس جواب سے کلیجہ تھام کر بیٹھ گیا۔ وہ قادر مغل سے اُلجھ کر اپنی بہن کی ازدواجی زندگی غارت کرنا نہیں چاہتا تھا اسلئے وہ چپ چاپ وہاں سے اُٹھ کر چلا گیا۔

قادر مغل پامیلا کے عشق میں پڑ کر دنیا و مافیہا کو بھول چکا تھا۔ وہ ہر دم ہر پل پامیلا کے آگے پیچھے کتے کی طرح دم ہلائے پھرتا رہتا تھا۔ وہ اگر اُس سے اُسکا کلیجہ مانگتی تو وہ نکال کے اُسکے ہاتھ پہ رکھ دیتا۔ پامیلا بھی اب اُس سے پیار کرنے لگی تھی۔ وہ اس حد تک اُسکا دیوانہ ہو چکا تھا کہ وہ جس چیز کی فرمائش کرتی وہ فی الفور اُسکے سامنے لاکر رکھ دیتا تھا۔ وہ جب خوش ہوکر اُسکا بوسہ لیتی تھی تو قادر مغل کو جیسے پنکھ لگ جاتے تھے اور وہ ہوا میں اُڑنے لگتا تھا۔ پامیلا کا پیار پا کر اب اُسکے رنگ و ڈھنگ ہی بدلنے لگے تھے۔ وہ جب پامیلا کے ساتھ باہر جاتا تھا تو اُسے اپنے ملنے جلنے والے بڑے حقیر اور کمتر لگتے تھے۔ پامیلا کی قربت نے اُسے بڑا اکڑ و اور گھمنڈی بنا دیا تھا۔ وہ پامیلا کو چھوڑ کے کسی کے ساتھ سیدھے منہ بات نہیں کرتا تھا۔ کوئی اگر پامیلا سے بات کرنے کی کوشش کرتا تھا تو وہ اُسے لتے لیتا تھا۔ ایک دو کی تو اُسنے

پٹائی بھی کی تھی۔

پامیلا کو خوش رکھنے کے لئے اُسے کئی لوگوں سے قرض بھی لینا پڑا۔ایک دن اُسنے پامیلا سے اپنے دل کی بات کہی۔

''میم صاحب اب مجھ سے لوگوں کے طعنے سنے اور سہے نہیں جاتے۔آتے جاتے پاس پڑوسی میری کھلی اُڑاتے ہیں۔مجھ پر پھبتیاں کستے ہیں۔آخر مجھے کب تک یہ سب کچھ سہنا پڑے گا۔میم صاحب آپ کی خاطر میں نے اپنے بال بچوں کو چھوڑ دیا۔آپ نے جس چیز کی فرمائش کی میں نے لاکر رکھ دی۔آپ کو خوش رکھنے کے لئے میں نے باہر سے اُدھار بھی لیا۔آخر ہم کب تک اس طرح کی زندگی جی لیں گے۔میں چاہتا ہوں کہ ہم جلد سے جلد شادی کرلیں تاکہ میں اُن تمام لوگوں کا منہ بند کردوں جو میرا مذاق اُڑایا کرتے ہیں''

پامیلا نے اُسکے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور اُسے بڑے پیار سے سمجھاتے ہوئے بولی۔

''شادی ہوگی ضرور ہوگی مگر اُس سے پہلے تمہیں اپنی پہلی بیوی سے طلاق لینی ہوگی۔''

''آپ کہو تو میں کل ہی اُسے طلاق دے دوں گا۔''

''گڈ'' پامیلا نے خوش ہوکر کہا۔''تو کل جاکے اُسے طلاق دے دو''

پامیلا کے کہنے کی دیر تھی۔قادر مغل نے اگلے روز شمینہ کو طلاق دے دی۔شمینہ کو قادر مغل کے اس فیصلے سے بڑا صدمہ ہوا۔بہر حال اُسنے قسمت کے اس مذاق سے چپ چاپ صاد کرلیا۔شمینہ سے خلاصی پاکر اب قادر مغل پامیلا کے پیچھے پڑ گیا کہ وہ نکاح کے لئے ہاں کہہ دے۔پامیلا نے ایک رات اُسے بڑے پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''تم سے شادی کرنے سے پہلے میں اپنے ماں باپ سے ملنا چاہتی ہوں۔میں چاہتی ہوں کہ میری جو لنڈن میں جائیداد ہے اُسے بیچوں اور وہ سارا پیسہ تمہارے اکاونٹ میں ٹرانسفر کروادوں۔میں چاہتی ہوں کہ ہم دونوں ایک خوشحال زندگی گزار سکیں۔یہ سب کرنے کے لئے مجھے چند روز کے لئے لنڈن جانا پڑے گا۔اگر تم میرے لئے لنڈن کی ایک ٹکٹ کا انتظام کرپاوگے تو بڑی مہربانی

ہو گی''

کروڑوں کی جائیداد پانے کے تصور سے قادر مغل کا ہارٹ فیل ہوتے ہوتے بچا۔ وہ اس خیال سے پھولے نہیں سما رہا تھا کہ پامیلا لنڈن جا کر اپنی جائیداد بیچ ڈالے گی اور پھر وہ سارا پیسہ اُسکے اکاونٹ میں ڈال دے گی۔ یعنی چت بھی اُسکی اور پٹ بھی اُسکی۔ کروڑوں پانے کے لئے اگر اُسے چند لاکھ خرچ کرنے پڑیں گے تب بھی یہ گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔ وہ بنک کے پاس اپنا ہاوس بوٹ گروی رکھ کر پانچ لاکھ کا قرضہ لے کے آیا اور اُسنے وہ سارے پیسے پامیلا کے سامنے رکھ دئے۔ پامیلا نے اُسے پیار کر کے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''قادر تم کتنے اچھے ہو اور مجھ سے کتنا پیار کرتے ہو۔ میں لنڈن جاوں گی اور وہاں سے ڈھیر سارا پیسہ لے کر آوں گی۔ پھر ہم دو ہاوس بوٹ اور خریدیں گے۔ ایک میں ہم دونوں رہیں گے اور ایک ہم ٹورسٹوں کے لئے رکھیں گے۔ تم فکر مت کرنا۔ بس ایک بار میں لنڈن پہونچ گئی تو تمہاری ساری اُلجھنیں ختم۔ پھر موج ہی موج۔''

''میم صاحب لنڈن پہونچ کے تم مجھے بھول تو نہیں جاوگی؟''

''کیسی بات کرتے ہو تم قادر۔ تم مجھ سے جتنا پیار کرتے ہو اُس سے کہیں زیادہ میں تم سے پیار کرتی ہوں۔ مجھے لنڈن پہونچنے دو پھر دیکھنا میں تمہاری قسمت کیسے بدل کے رکھ دوں گی۔ جو لوگ تمہارا انداق اُڑایا کرتے ہیں نا وہی تم سے رشک کرنے لگیں گے''

قادر مغل کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو چھلک پڑے اور وہ جذباتی ہو کے اُسکے ہاتھوں کو چومتے ہوئے بولا۔

''تم خوشی خوشی جانا۔ پر جتنی جلدی ہو سکے لوٹ کے آجانا۔ میں تمہارے بنا اب ایک پل بھی رہ نہیں پاوں گا۔''

''میں بہت جلد لوٹ کے آوں گی۔'' کہہ کر اُسنے قادر مغل کا ایک بوسہ لیا۔ قادر مغل اس بوسے کی لذت سے شرابور ہو گیا اور وہ پامیلا کا سامان اپنی پیٹھ پر لاد کر ایک حمال کی طرح ٹیکسی کی طرف

دوڑا اور اُسمیں اُسکا سامان رکھنے لگا۔ پامیلا آ کر ٹیکسی میں بیٹھ گئی اور ٹیکسی ائیر پورٹ کے لئے روانہ ہوئی۔ قادر مغل آنکھوں میں آنسو لئے بہت دیر تک ہاتھ ہلاتا رہا۔ پامیلا کے جانے کے بعد قادر مغل بے چین و بے قرار رہنے لگا۔ اُسکی جدائی میں اُسنے اپنے دن کا چین اور رات کا آرام کھو دیا۔ وہ رات بھر اُسکی یاد میں آنسو بہاتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی اُسکے دل میں یہ سوچ کر ہول اُٹھنے لگتا تھا کہ اگر وہ لوٹ کر نہیں آئی تو اُسکے قرضے کا کیا ہوگا۔ اُسکے ہاوس بوٹ کا کیا ہوگا۔؟ وہ دن میں دو دو تین تین بار پوسٹ آفس میں یہ پتا کرنے جاتا تھا کہ کہیں لنڈن سے اُسکے نام کوئی چٹھی تو نہیں آئی ہے۔ وہ ہر روز ایک آس لے کر جاتا تھا، پر نراش ہو کے لوٹتا تھا۔ پامیلا کا کوئی خط مہینوں نہیں آیا۔ ادھر کاروباری حالات بھی ٹھیک نہیں چل رہے تھے۔ وہ اب تک بنک کی کوئی قسط بھی بھر نہیں پایا تھا۔ ایک طرف بنک کی قسطیں تو دوسری طرف ثمینہ کی طرف سے بچوں کی کفالت کا تقاضا بھی بڑھتا ہی چلا جارہا تھا۔ وہ عجب دگدھا میں پھنسا ہوا تھا۔ وہ کیا کرے کہاں جائے اُسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

ایک دن وہ سویرے سویرے ہی ڈاک خانے کا طواف کرنے پہونچ گیا۔ ڈاکیہ نے جب باہر آ کر اُسے یہ اطلاع دی کہ اُسکے نام لنڈن سے ایک رجسٹری آئی ہے تو قادر مغل کا کلیجہ مارے خوشی کے اُچھل کر حلق میں آ کر اٹک گیا۔ یہ مژدہ سن کر قادر مغل کو جیسے پنکھ لگ گئے۔ اُسے لگا کہ اُسکے نحوست کے دن لد گئے۔ پامیلا نے اُسے بہت بڑی رقم لنڈن سے بھیجی ہوگی۔ وہ اب بنک کا سارا قرضہ چکا دے گا۔ پھر لنڈن کا ٹکٹ نکال کر پامیلا کے پاس چلا جائے گا۔ وہ سرعت کے ساتھ پوسٹ ماسٹر کے کیبن میں جا کر کھڑا ہو گیا اور اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے پوسٹ ماسٹر سے بولا۔

''وہ لنڈن سے میرے نام کی ایک چھٹی آئی ہے۔ زرا جلدی سے نکال کے دے دیجئے''

پوسٹ ماسٹر نے ایک تیکھی نگاہ اُس پر ڈال دی اور پھر ادھر اُدھر ہاتھ مارتے ہوئے اُس نے ایک چٹھی نکال کر قادر مغل سے ایک رسید پر دستخط لئے اور پھر وہ چٹھی قادر مغل کے ہاتھ میں دے دی۔ قادر مغل نے کانپتے ہاتھوں سے وہ چٹھی کھولی اور پھر اُسے پڑھنے لگا۔ چٹھی پڑھتے پڑھتے اُسکی آنکھوں کے

آگے اندھیرا چھا گیا اور وہ تیوار کر نیچے گرا۔ باہر کھڑے لوگوں میں اُس کے کچھ جان پہچان کے لوگ بھی شامل تھے۔ وہ فوراً اُسکی طرف لپکے۔ اُنہیں لگا کہ قادر مغل ٹیں ہوگیا۔ کسی نے اُسکی نبض ٹٹولی۔ دیکھا نبض چل رہی ہے۔ کوئی بلا مانس پانی لے کے آگیا اور اُسکے منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔ قادر مغل کو ہوش آگیا اور وہ خفیف ہو کر کھڑا ہوگیا اور چپ چاپ پوسٹ آفس کے احاطے سے باہر نکل گیا۔ اُسنے کسی کی بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ تیزی سے وہاں سے نکل گیا۔ جب وہ بلوارڈ روڈ پر پہونچ گیا تو وہ ایک منڈھیر پر بیٹھ کر دہاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ اُسکے سارے خواب چکنا چور ہو گئے تھے۔ پامیلا نے اُسے تباہ و برباد کر کے رکھا تھا۔ وہ لنڈن میں کسی انگریز کے ساتھ شادی کے بندھن میں بندھ گئی تھی۔ وہ قادر مغل کو بیوقوف بنا کر نہ صرف اُسکی گھر گرہستی بگاڑ کے چلی گئی تھی بلکہ اُسے مقروض بھی بنا دیا تھا۔ اُسے اپنے اوپر بھی رہ رہ کے غصہ آرہا تھا کہ کیوں اُسنے اُسکے جھوٹے پیار کے بھرم میں پڑ کر اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ وہ تو اُسکے دل سے کھیل کر کسی اور کی ہوگئی تھی۔

قادر مغل ایک عجب دوراہے پر کھڑا تھا۔ وہ کہاں جائے، کیا کرے اُسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اُسے شمینہ شدت سے یاد آنے لگی۔ شمینہ جس کے ساتھ اُسنے ہمیشہ جفا کی مگر اُسنے جفا کے بدلے اُس سے وفا کی۔ وہ شمینہ سے ملنا چاہتا تھا اور اُسے منا کر اپنے گھر واپس لے آنا چاہتا تھا۔ وہ بکھرے ہوئے تنکے جوڑ جوڑ کر وہ پھر سے اپنا گھونسلہ آباد کرنا چاہتا تھا۔ وہ جب علی چاپری کے ہاوس بوٹ کی طرف بڑھ رہا تھا تو اُسے لگ رہا تھا جیسے اُسکے پاوں من من بھر کے ہو گئے ہوں۔ وہ کس منہ سے شمینہ کا سامنا کر پائے گا۔ کیا وہ اُسے معاف کرے گی؟ ایک موہوم سی اُمید اب بھی اُسکے دل میں قائم تھی کہ شمینہ اُسے معاف کرے گی۔ اپنے لئے نہ سہی اپنے بچوں کی خاطر۔

وہ جب علی چاپری کے ہاوس بوٹ کے پاس پہونچ گیا تو اُسنے دیکھا کہ کئی لوگ ہاوس بوٹ میں آجا رہے ہیں۔ اُسنے ایک آدمی کو روک کر پوچھا۔

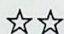
"یہ علی چاپری کے گھر میں کیا چل رہا ہے؟"

"تمہیں نہیں معلوم؟"

''نہیں تو'' اُسنے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔

''آج علی چاپری کی بہن کے نکاح ہو رہے ہیں''

یہ بات سنتے ہی قادر مغل کے سبھی اعضا جیسے یکلخت مفلوج ہو کے رہ گئے اور وہ تیورا کے نیچے گرا۔



بہت یاد آئے

ایک انسان کو اپنی جنم بھومی سے کتنی محبت ہوتی ہے اسکو تو لنے کا کوئی پیمانہ دستیاب نہیں ہے۔ ہر انسان کو اپنے وطن سے محبت ہوتی ہے۔ کہیں کم کہیں زیادہ اس کو اندازہ اُس وقت ہوتا ہے جب کوئی شخص اپنے وطن سے دور چلا جائے۔ ایسے حالات میں چلا جائے کہ واپس لوٹنے کی اُسے کوئی اُمید دکھائی نہ دے۔ چند لوگ اُمید کھودیتے ہیں۔ چند رجائی بھی ہوتے ہیں جو اُمید فردا پر جیتے ہیں۔ اُنہی افراد کے زمرے میں، میں اپنے آپ کو رکھتا ہوں۔ مجھے اپنے گاوں اپنے گھر سے دور ہوئے پچیس برس ہو چکے ہیں مگر میں نہ اپنے گھر کو بھول چکا ہوں نہ اپنے گاوں کو۔ یہ دونوں میرے لاشعور کے ساتھ چلتے رہے ہیں۔ یوں تو کشمیر میرے رم رم میں بسا ہوا ہے مگر میرا گاوں اور اُسکی یادیں ایک مرقع کی طرح میرے دل کے نہاں خانوں میں آباد ہیں۔ میرا گاوں میرے تصور کے کینواس پر اپنی تمام تر رنگینی، دلکشی اور رعنائی کے ساتھ چھایا ہوا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے یادوں کے یہ قافلے میرے ذہن کی پگڈنڈیوں پر ہر دم رواں دواں نظر آتے ہیں۔

میں تیس سال قبل کشمیر کے ایک پسماندہ گاوں میں پیدا ہوا تھا۔ اس گاوں کی آبادی تین چار سو نفوس پر مشتمل تھی۔ اکثریت مسلمانوں کی تھی جب کہ ہندو آٹے میں نمک کے برابر تھے۔ اس گاوں میں چند مکان ہی پختہ تھے۔ باقی سبھی مکان کچے تھے جن کی چھت گھاس پھوس کی ہوا کرتی تھی۔ اندر اور باہر کی دیواریں سفید مٹی سے لیپی جاتی تھیں۔ اس مٹی میں گوبر ملایا جاتا تھا جس سے کیڑے مکوڑے گھر کے اندر نہیں آتے تھے۔ فرش پر غالیچے یا دریاں نہیں بلکہ سوکھی گھاس بچھائی جاتی تھی جسے

چٹائیوں سے چھپایا جاتا تھا۔ جو متوسط طبقے کے لوگ ہوتے تھے وہ چادریں یا نمدے ڈالا کرتے تھے۔ اُن دنوں ڈیزائن والے نمدے سستے میں مل جایا کرتے تھے۔ رسوئیوں میں گیس چولھے نہیں ہوا کرتے تھے بلکہ مٹی کے چولھے اور ان چولھوں میں لکڑی جلائی جاتی تھی۔ لکڑی جلانے کے دو فائدے ہوتے تھے۔ ایک تو کھانا پک جاتا تھا۔ ساتھ میں کانگڑیوں کو گرم رکھنے کے لئے کوئلے مل جاتے تھے۔ بچی کھچی راکھ بھی استعمال میں لائی جاتی تھی۔ یہ راکھ ساگ زاروں میں کھاد کے طور پر ڈالی جاتی تھی۔ کچھ بھی بے کار میں نہیں جاتا تھا۔ ہر چیز کو مصرف میں لایا جاتا تھا۔

اس گاوں میں جتنے بھی مکان تھے ایک دوسرے سے لگ کے نہیں تھے بلکہ دور دور بنے تھے۔ گھر کے باہر ایک کھلا آنگن ہوا کرتا تھا جسمیں اخروٹ کے درخت سایہ پھیلائے نظر آتے تھے۔ یہ درخت نہ صرف اخروٹ دیتے تھے بلکہ گرمیوں میں مچھروں کو بھی دور رکھتے تھے کیونکہ ان سے نکلنی والی گند مچھروں کو بھگا دیتی تھی۔ ان درختوں کے چھلکوں کو دانتون کے طور پر استمال کیا جاتا تھا۔ ان چھلکوں کو دانتوں پر رگڑنے سے نہ صرف دانت موتیوں کی طرح چمکنے لگتے تھے بلکہ منہ کی بد بو سے نجات ملتی تھی۔ لڑکیاں ان چھلکوں کا زیادہ استمال کرتی تھیں کیونکہ ان سے ہونٹ لال ہو جاتے تھے اور یہ لالی مہینوں تک نہیں جاتی تھی۔ اخروٹ کے درختوں کے علاوہ اناروں کے درخت بھی وافر مقدار میں نظر آتے تھے۔ ساتھ ہی آنگن کے کسی کونے میں گلاب کی جھاڑی مہکتی لہکتی دکھائی دیتی تھی۔ یہ گلاب عام گلابوں سے مختلف ہوا کرتے تھے۔ یہ ہلکے گلابی رنگ کے پھول ہوتے تھے جو کہ گل قند بنانے کے کام آتے تھے۔ سردیوں میں اس گل قند کا سردی زکام اور کھانسی سے بچنے کے لئے استمال کیا جاتا تھا۔ یہ ایک ایسی اکسیر تھی جو ہر گھر میں پائی جاتی تھی۔

اس گاوں میں دودھ کی کوئی دکان نہیں تھی۔ ہر گھر میں ایک عدد گائے ہوا کرتی تھی۔ جس گھر میں گائے نہیں ہوتی تھی تو اُسکی ضرورت پڑوسی پوری کر دیتے تھے۔ ایمانداری ایسی تھی کہ کوئی دودھ میں پانی نہیں ملاتا تھا۔ تھن کا دودھ پڑوسی تک پہنچ جاتا تھا۔ ہم صاحب حثیت لوگوں میں سے تھے اس لئے ہمارے گھر میں ایک نہیں کئی گائیں ہوا کرتی تھیں۔ گھر میں دودھ کی ندیاں بہتی تھی۔ جب

اماں دودھ بلور نے بیٹھ جاتی تھیں، تو پڑوس کی عورتیں اپنا اپنا برتن لے کر دوڑتی ہوئی اماں کے پاس چلی آتی تھیں اور پھر بھر بھر کے چھاچھ لے کر جاتی تھیں۔ جب اماں دہی متھنے بیٹھ جاتی تھیں تو گھر کے سبھی بچے اماں کے گرد غول بنا کر بیٹھ جاتے تھے تا کہ انہیں تازہ تازہ مکھن کھانے کو ملے۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب لوگوں کے پاس پیسہ نہیں تھا پھر بھی وہ خوش تھے۔ ساگ بھات کھا کے لوگ مست رہتے تھے۔ گاوں میں کوئی اسپتال نہیں تھا، ایک چھوٹی موٹی ڈسپنسری تھی پھر بھی لوگوں کو اسکی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی کیونکہ گاوں میں شاذ و نادر ہی کوئی بیمار پڑ جاتا تھا۔ کینسر، شوگر، بلڈ پریشر جیسی بیماریوں کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا۔ جب ان بیماریوں کے ساتھ کسی کا واسطہ ہی نہیں پڑا تو وہ کیسے جان پاتا۔ اُن دنوں ایک ہی مہلک اور متعدی بیماری ہوتی تھی جس کا نام ہیضہ تھا۔ جب وبا پھیلتی تھی تو بہت سارے لوگ لقمہ اجل بن جاتے تھے لیکن جب سے سرکار نے ٹیکے لگوائے تو یہ بیماری بھی ناپید ہوگئی۔

گاوں کی آب و ہوا صاف اور تازہ ہوا کرتی تھی۔ پانی شدھ اور شیتل۔ پانی کا کوئی ذخیرہ نہیں ہوتا تھا بلکہ پانی چھوٹی چھوٹی ندی نالوں میں بہتا رہتا تھا اور اسی پانی کو استعمال میں لایا جاتا تھا۔ اس پانی کو صاف رکھنے کے لئے نہ کوئی دوائی ملائی جاتی تھی اور نہ ہی اس پانی کا کسی لیبارٹی میں ٹسٹ کیا جاتا تھا۔ یہ پانی تو پہاڑوں کی کوکھ سے نکل کر سیدھے گاوں کے تلابوں اور جھرنوں میں پہنچ جاتا تھا اور لوگ اسے پی کر تروتازہ ہو جایا کرتے تھے۔ دست لگنا، یا پیٹ خراب رہنا اس طرح کی کوئی شکایت کبھی سننے کو نہیں ملتی تھی۔ اسی پانی سے نہایا جاتا تھا۔ اسی پانی سے کپڑے دھوئے جاتے تھے اور یہی پانی ڈنگروں کو پلایا جاتا تھا۔

قدرت کا اپنا ایک مستحکم نظام تھا جو بڑے قائدے سے چل رہا تھا۔ گاوں میں سواری کے لئے گھوڑے یا تانگے ہوا کرتے تھے۔ گاڑیاں برائے نام تھی۔ کوئی بڑا افسر گاڑی میں نظر آتا تھا۔ اُن دنوں لوگ اپنی ٹانگوں کا زیادہ استمال کیا کرتے تھے۔ پیدل چلنے سے ہر کوئی صحت منداور چاق و چوبند نظر آتا تھا۔ سوائے چند زمینداروں کے کوئی طلب پر نوکر نہیں رکھتا تھا۔ لوگ خود کھیتوں میں جا کر کام کرتے تھے۔ وہ چاہے کھیت جوتنا ہو۔ پٹرہ پھیرنا ہو، بیج بونا ہو۔ پنیری لگانا ہو، نلائی کرنا ہو یا کٹائی کرنا۔ لوگ جھنڈ

بنا کے کام کرتے تھے۔ وہ چاہے کٹائی کرنا ہو۔ دھان کو گھر لانا ہو یا اسکی چھٹائی کرنی ہو۔ یہ ایک آدمی کے بس کی بات نہیں ہوتی تھی اسلیئے ہوتا کیا تھا کہ محلے کے چند لوگ مل کر باری باری ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ جس کے یہاں وہ کام کرنے جاتے تھے وہ دو پہر اور شام کو اُنکے طعام کا انتظام کرتا تھا۔ کوئی مزدوری نہیں کوئی معاوضہ نہیں۔ بس کھانا پینا اور ساتھ میں مل کر گانا۔ مرد ایک طرح کے گانے گاتے تھے جب کہ عورتیں رف گیت گایا کرتی تھیں۔

یہ گاوں اپنی دلکشی اور موہنی میں کوئی ثانی نہیں رکھتا تھا۔ گاوں میں جگہ جگہ چنار کے درخت اپنے خنک سایے پھیلائے نظر آتے تھے۔ انکے سایہ افگن میں بیٹھ کر جس فرحت کا احساس ہوتا تھا اُسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کڑاکے کی گرمی ہو یا مینہ برس رہا ہو، ہر کوئی ان چناروں کے سایے تلے آتا تھا اور یہ چنار اپنی بانہیں پھیلائے ہر مسافر کو اپنی پناہ میں لیتا تھا۔ اسکے علاوہ بید اور سفیدے کے درختوں کی لمبی قطاریں جا بجا دیکھنے کو ملتی تھیں۔ قل قل کرتی ندیوں کے کنارے بید کے یہ درخت سنتریوں کی طرح کنارے کنارے اس ندی کے ساتھ چلتے ہوئے نظر آتے تھے۔ گاوں میں کئی گن گناتے آبشار تھے جو ہر دم فضا میں راگ آلاپتے رہتے تھے۔ دو چار خاموش تالاب تھے جن میں جب گاوں کی کوئی حسینہ اپنا مٹی کا گھڑا ڈال کر پانی کی لہروں کو مرتعش کرتی تھی تو برف پوش چوٹیوں کا عکس منتشر ہو جاتا تھا اور ننھی ننھی لہریں مضطرب ہو کر کناروں سے ٹکرانے لگتی تھیں۔ انکے ٹکرانے سے ایک ہلکا سا آہنگ پیدا ہوتا تھا جو اس حسینہ کی گنگناہٹ کو پس منظر کا سنگیت عطا کرتا تھا۔ ہائے اس سادگی میں کیسے دلفریب اور دلکش مناظر دیکھنے کو ملتے تھے۔ شام کو جب سورج اُفق پر شفق زار کھلائے پہاڑوں کی اوٹ میں چھپنے کی کوشش کرنے لگتا تھا تو گاوں کی جوان اور ادھیڑ عمر کی عورتیں سروں پر گھاس کی گٹھریاں لے کر جب ایک قطار میں گھر کی طرف جانے لگتی تھیں تو دیکھنے والوں کو ایسا لگتا تھا جیسے آسمان سے حوروں کا قافلہ اُتر گیا ہو جو سروں پر گھاس کی گٹھریاں لے کے نہیں بلکہ جنت کی سوغات لے کر خرام ناز کے ساتھ بستی کی طرف چلی آرہی ہیں۔ چاروں اطراف سنتریوں کی طرح کھڑے کوہسار جن کی برف پوش چوٹیاں سفید صافوں کی طرح انکے سروں پر بندھے نظر آتے تھے۔ جب سپید بادل ان چوٹیوں کے طبے پر آ کے ٹھہر جاتے تھے تو ایسا لگتا

تھا جیسے کئی ساری حسیناؤں نے اپنے سفید ڈوپٹے یہاں لہرا دئے ہوں۔ ان پہاڑوں سے اُٹھنے والے بھپارے جب آسمان کی طرف بڑھنے لگتے تھے تو بارش کی ننھی ننھی بوندیں زمین پر گرنے لگتی تھیں۔

ہمارے یہاں ایک نوکر کام کرتا تھا جس کا نام گل محمد تھا۔ وہ اصل میں ایک گوجر تھا جو ہمارے گاوں سے بہت دور دودھ پتھری کے کوہستانی علاقے میں رہتا تھا۔ ہم چونکہ شہر سے بہت قریب تھے اسلئے یہاں تہذیب پوری طرح پنپ چکی تھی۔ جب تہذیب پنپتی ہے تو غریب حقیر اور امیر عظیم بن جاتا ہے۔ گل محمد بڑا ہی مفلس و نادار تھا۔ کیا ہوا اگر وہ خوبصورت تھا۔ کیا ہوا اگر وہ اپنے کسرتی بدن پر نازاں تھا۔ جنگل کی کانٹوں بھری جھاڑی میں اگر پھول نکلیں تو وہ پھول اُن پھولوں کے آگے ہیچ لگتے ہیں جو کیاریوں میں کھلتے ہیں۔ گل محمد گبرو جواں تھا۔ اُسکے بدن کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے کسی لوہار نے اپنے اہرن پر گرم تانبے کے اس بت کو پیٹ پیٹ کر بنایا ہو۔ پر اس کسرتی بدن کا کیا فائدہ۔ اُسکا یہ تانبے کی طرح سخت بدن ناداری کی دھوپ میں ماند پڑتا جا رہا تھا۔ گل محمد کو اس بستی کا کوئی بھی فرد اُسکے اصلی نام سے نہیں بلاتا تھا۔ لوگ اُسے گولو کہہ کر بلاتے تھے۔ کچھ حقارت سے اور کچھ طنزاً۔ اُسکا قصور بس اتنا تھا کہ وہ گوجر تھا اور اپنا پیٹ پالنے کے لئے ہمارے مال مویشی چرانے کا کام کرتا تھا۔ وہ جتنا جفاکش تھا اُتنا ہی سیدھا بھی تھا۔ لوگ اُسکے بھولے پن کا ناجائز فائدہ اُٹھاتے تھے اور اُسکی شرافت کا استحصال کیا کرتے تھے۔ کسی کو بازار سے کچھ منگوانا ہو تو اُسے ہی دوڑاتے تھے۔ چاہے بھری دھوپ ہو یا آکاش سے جھر جھر بہتا پانی۔ کسی کی گائے یا بکری بچہ دینے والی ہو تو اُسے ہی دائی جنائی کا کام کرنا پڑتا تھا وہ بھی مفت میں۔ اُسے ایک پل کا سکون نصیب نہیں تھا۔ جہاں وہ ایک لحظہ کے لئے دم سادھنے بیٹھ جاتا تھا تو کوئی نہ کوئی بلانے چلا آتا تھا اور اُسے یہ کام وہ کام دیگر دوڑاتا رہتا تھا۔ اُسکی حثیت آبے لونڈے جابے لونڈے کی سی تھی۔ وہ کم بخت بھی نہ جانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا کہ نہ وہ کبھی تھکتا تھا اور نہ وہ رکتا تھا۔ جب دیکھو یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں بھاگ رہا ہے دوڑ رہا ہے اور چہرے پر ایک بھی شکن نہیں۔ دل میں کوئی ملال نہیں۔ فطرت نے جیسے اُسکے اندر یہ بات ڈال دی تھی کہ اُسے لوگوں کی خدمت کے واسطے جینا ہے اور وہ وہی کر رہا تھا۔

اُن ہی دنوں ہمارے گاوں میں ایک عورت آکے رہنے لگی جس کا نام زینت تھا۔ وہ بیوہ تھی۔ اُسکا شوہر ایک سال پہلے حرکت قلب بند ہو جانے سے فوت ہو چکا تھا۔ زینت کا ایک دو سالہ بچہ تھا۔ وہ جوان جہان عورت۔ آگے ہاتھ اور پیچھے پات۔ سر پر کسی مرد کا سایہ نہیں۔ اس طرح کی رانڈ کھلی دکان کی طرح ہوتی ہے۔ جس کا جب من چاہے اس دکان میں رکھی چیزوں کو ٹٹولے۔ لینے کا ارادہ نہ ہو تب

بھی وہ اس دکان میں گھس جائے اور ہر چیز پر نظر ڈالے۔اس طرح کی عورتوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ایک دن یہ عقدہ کھلا کہ یہ رانڈ جس گاوں میں پہلے رہتی تھی وہاں یہ کافی بدنام تھی۔روز روز کی زلت سے بچنے کے لئے اُسنے وہ گاوں چھوڑ دیا تھا اور ہمارے گاوں میں آ کر بس گئی تھی مگر یہاں بھی بدنامی نے اُسکا پیچھا نہیں چھوڑا۔یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ یہ رانڈ بدچلن ہے اور وہ جسم فروشی کا دھندہ کرتی ہے تو بزرگوں نے اُس پر تبرہ بھیجنا شروع کیا جب کہ منچلے اُسکے گھر کے اردگرد پیاسے بھنوروں کی طرح منڈھلانے لگے۔اُسکا وجود دو طبقوں میں بٹ چکا تھا۔ایک طبقہ اُس سے نفرت کرتا تھا اور دوسرا اُس کی قربت حاصل کرنا چاہتا تھا مگر کھلے عام کوئی اس طرح کی جسارت کر نہیں پاتا تھا کیونکہ گاوں کے بڑے بزرگ کنڈلی مارے سانپ کی طرح اُسکے گرد ہالہ بنا کے بیٹھے تھے۔کہتے ہیں بدا چھا بدنام برا۔سچ کیا تھا یہ تو اللہ مولا ہی جانے مگر گاوں والے اُسے بدکاری کے زمرے میں ڈال چکے تھے۔ایک طرح سے گاوں کے بزرگوں نے اُسکا حقہ پانی بند کر دیا تھا۔وہ اپنے کمرے میں ایک قیدی کی طرح مقید ہو کر رہ گئی تھی۔گھر سے باہر آتی تھی تو ہر کوئی اُسے ایسی گرسنہ نظروں سے گھورنے لگتا تھا جیسے وہ مٹھائی کی بھری پری دکان ہو۔جو اُسے بدچلن اور بدکار ثابت کرنے میں تاویلوں کی جھڑی لگاتے تھے وہ بھی اُسے دیکھ کر آنکھیں سینکنے لگتے تھے۔اسمیں شک نہیں کہ وہ بیحد خوبصورت تھی۔دراز قد چھیریرا بدن۔ہرنی جیسی اُسکی دو کجراری آنکھیں۔لمبی عنبریں زلفیں لال گلال جیسے اُسکے رخسار اور ان رخساروں پر پڑھنے والے دو گڑھے جو اُسکی موہنی کو چار چاند لگاتے تھے۔ایسی عورت کو دیکھ کے کسی کا ایمان نہ ڈگمگا جائے۔پر سماج نے اُسکے گرد جو ہالہ کھینچا تھا اُسے پار کرنا آسان نہ تھا۔

ایک دن جب اُسکا بچہ بھوک کے مارے بلک رہا تھا تو گلو نے بچے کی پکار سنی۔اُس سے رہا نہ گیا۔وہ سماج کی پرواہ کئے بنا اُس عورت کے گھر میں گھسا۔دیکھا کہ وہ بچے کو گود میں لے کر رو رہی تھی۔اُسے روتے دیکھ کر گلو کا کلیجہ ریزہ ریزہ ہو گیا۔اُس نے زینت سے پوچھا۔

''تم کیوں رو رہی ہو؟''

''روؤں نہیں تو اور کیا کروں۔کل سے میرا بچہ بھوکا ہے۔باہر جاتی ہوں تو لوگ میرے

پیچھے ایسے ہو لیتے ہیں جیسے میں باوری کتیا ہوں۔ میں کیا کروں، کہاں جاوں''۔

گلو کا دل بھر آیا۔ وہ کچھ نہ بولا۔ تیزی سے کمرے سے نکل گیا اور سیدھے میری اماں کے پاس پہنچا۔ آتے ہی اُسنے اماں سے کہا۔

''ماں جی مجھے بیس روپے دے دو۔''

''تمہیں آج اچانک پیسے کی ضرورت کیوں آن پڑی؟''

''ماں جی اس وقت مجھ سے کوئی سوال نہ پوچھو۔ بس جلدی سے بیس روپے نکال کے دے دو۔''

اماں نے بیس روپے انٹی سے نکال کر اُسے دئے۔ گلو بیس روپے لے کے سرپٹ بازار کی طرح بھاگا اور بیس روپے میں چاول۔ نون تیل، چائے پتی اور دودھ لے کے زینت کے پاس پہنچا۔ یہ ساری چیزیں دیکھ کے زینت کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو چھلک پڑے اور وہ تحسین بھری نظروں سے گلو کی طرف دیکھ کے بولی۔

''میں تمہارا یہ احسان کیسے چکا پاوں گی؟''

''کیسا احسان۔ ایک بلکتے بچے کو روٹی کھلانا کوئی احسان نہیں ہوتا۔ اب اگر تم احسان کی قیمت ہی چکانا چاہتی ہو تو.........''

زینت نے چونک کر گلو کی طرف دیکھا۔ گلو بڑی بے پروائی سے بچے کے بالوں کو سہلاتے ہوئے بولا۔

''سب سے پہلے اس بچے کو کچھ کھلا دو تو میں سمجھوں گا کہ مجھے میرے کام کا صلہ مل گیا''

زینت کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ جا کر چاول دھونے لگی۔ گلو چپ چاپ کمرے سے نکل گیا۔ ایک سکون اور مسرت کا احساس اُسکے دل میں ہلکورے مار رہا تھا۔

اُس دن کے بعد ایک گلو تھا جو اُس سے بے دغدغے اور بے کھٹکے ملنے جایا کرتا تھا۔ اُسکا کوئی بھی کام ہو وہ بے غرض کر لیا کرتا تھا۔ بزرگ تو اُسکی دیدہ دلیری پر بیحد خفا تھے جب کہ منچلوں کی نظر

میں وہ خار کی طرح کھٹک رہا تھا۔ اُنہیں لگ رہا تھا جو کام وہ نہیں کر پائے وہ اس لونڈے نے کر دکھایا۔ وہ رقابت اور حسد کی آگ میں جلنے لگے۔ اُنہوں نے بزرگوں کو اُسکے خلاف اُکسایا۔ ایک دن سب نے مل کر اُسے گھیرا۔ بات لے دے سے شروع ہوئی۔ جب گلو کے تیور بگڑے تو اُس نے ایک دو کو دھکا مار کر نکل جانے کی کوشش کی۔ بس پھر کیا تھا۔ سبھی لوگ اُس پر ٹوٹ پڑے۔ سب نے مل کر اُسکی جم کر پٹائی کی۔ وہ لہولہان ہوا مگر اُسنے ہار نہیں مانی۔ وہ گر کے پھر اُٹھا اور دو چار کو چت کر کے نکل گیا۔

گھر آیا تو اُسکی ہیت کذائی دیکھ کے اماں چھاتی پیٹنے لگی۔ گلو اپنا خون پونچھتا ہوا اماں سے بولا۔

''میں ڈرنے والا نہیں ہوں۔ کل جا کے پھر زینت سے ملوں گا۔ دیکھتا ہوں کوئی میرا کیا بگاڑتا ہے؟''

اماں کے پلے کچھ نہیں پڑا۔ یہ زینت کون ہے اُسے اس بارے میں کوئی آگہی نہیں تھی۔ وہ تو گلو کا بہتا خون دیکھ کر واویلا کرنے لگی تھی۔ اتنے میں بابو جی آ گئے۔ اُن کو باہر سے سب معلوم پڑ چکا تھا۔ اُنہوں نے گلو کی سرزنش نہیں کی۔ وہ اُسے لے کر ڈسپنسری میں چلے گئے اور اُسکی مرہم پٹی کروائی۔ ایک بار اُنہوں نے اُس سے اس قصے کے بارے میں کوئی استفسار نہیں کیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ گلو اپنے سینے میں ایک دردمند دل رکھتا ہے۔ کسی کا دکھ اُس سے دیکھا نہیں جاتا۔ جس کی فطرت میں دوسروں کی مدد کرنے کا مادہ ہو وہ کسی کے کہنے سننے سے اپنی خو بو بدل نہیں سکتا۔

زینت کو گاؤں سے نکالنے کی تیاریاں شروع ہو گئیں تھیں۔ گاؤں کے بزرگ ایسی بدکار عورت کو اپنے یہاں پناہ دینا نہیں چاہتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ آج تک کسی نے اُسے غلط کام کرتے ہوئے پکڑا نہیں تھا۔ بس یہ افواہ تھی جس نے اُسکا جینا حرام کر دیا تھا۔ یہ بدنامی کا داغ اُسکے کردار پر ایسے ثبت ہو کے رہ گیا تھا کہ وہ لاکھ اُسے دھونے کی کوشش کرتی تب بھی یہ داغ دھلنے والا نہیں تھا۔ وہ جہاں جاتی بدنامی اُسکا پیچھا کرتی رہتی۔ اس طرح اُس کی زمین تنگ ہوتی جا رہی تھی۔ اُسنے کئی بار سوچا کہ وہ اس زلت بھری زندگی سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا پا لے مگر اس معصوم کا سوال آتے ہی اُسکے ارادے کمزور پڑ

جاتے تھے۔

جس دن کچھ لوگ اُسے گاوں سے باہر کرنے کے لئے اُسکے گھر کے باہر جمع ہو گئے تو گلو جو ہمارے گھر میں کام کر رہا تھا اُسے کہیں سے بھنک لگ گئی۔ بس پھر کیا تھا۔ وہ ہاتھ میں ایک کلہاڑی لے کے دوڑ پڑا۔ اُسکے سر پر خون سوار تھا۔ جب بھیڑ نے اُسے اس قدر خوفناک تیور کے ساتھ آتے دیکھا تو وہ پیچھے ہٹ گئے۔ وہ تہدیدی انداز میں بھیڑ سے مخاطب ہو کے بولا۔

''جس نے ماں کا دودھ پیا ہے وہ زینت کی طرف قدم بڑھا کے دکھائے۔ قسم رب کی کشتوں کے پشتے لگ جائیں گے۔ آج میں سر پر کفن باندھ کے آیا ہوں۔ ایک کمزور عورت پر زورزبردستی دکھانا مردانگی نہیں ہے۔ مرد ہو تو مجھ سے آ کے لڑو۔''

بھیڑ پیچھے ہٹ گئی۔ ایک بزرگ موقع کی نزاکت سمجھ کر آگے بڑھا اور اُسنے بڑے پیار سے گلو کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''دیکھ بیٹا ہم یہاں لڑنے نہیں آئے ہیں۔ تم ایک سمجھدار انسان ہو۔ نیک و بد سمجھتے تو ہو۔ یہ عورت جس کی تم طرفداری کرنے آئے ہو اسکا چلن ٹھیک نہیں ہے اسلئے ہم نہیں چاہتے کہ اس کے رہتے ہوئے یہاں کے نوجوانوں کی عاقبت بگڑ جائے اور نہ وہ اس دنیا کے رہیں اور نہ اُس دنیا کے۔ بہتر یہی ہوگا کہ یہ اس گاوں سے نکل جائے۔ اسمیں سب کا بھلا ہے۔''

''چاچا تم کس کردار کی بات کرتے ہو۔ کسی پر اُنگلی اُٹھانے سے پہلے اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو۔ میں یہاں کے سبھی لوگوں کے کردار سے واقف ہوں۔ اس حمام میں سبھی ننگے ہیں۔ کس عورت کے کس سے کیا تعلقات ہیں اگر میں پردے ہٹانے لگوں تو تم سب سفید پوش کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گے۔ جس عورت کے کردار پر تم کیچڑ اُچھال رہے ہو وہ اگر پیشہ بھی کرتی ہے تب بھی یہ عورت قابل پرستش ہے کیونکہ یہ اگر اپنے جسم کو بیچ رہی ہے تو عیاشی کے لئے نہیں بلکہ اُس نونہال کی پرورش کر رہی ہے جسے تم مار ڈالنا چاہتے ہو۔ یہ ایک ماں ہے اور ماں کا وجود قابل نفرین نہیں ہوتا بلکہ قابل پرستش ہوتا ہے۔''

''میں مانتا ہوں کہ وہ ایک ماں ہے مگر تمہارا اس سے کیا رشتہ ہے۔ کیا لگتی ہے یہ تمہاری؟''

''افسوس کہ تمہارے پاوں قبر میں لٹک رہے ہیں پھر بھی تم میرے نیک جذبے میں رشتہ تلاش رہے ہو۔ تم اسکا اور میرا رشتہ جاننا چاہتے ہو نا تو سن لو یہ میری ماں ہے اور ایک بیٹے کے ہوتے ہوئے کوئی ماں لاوارث نہیں ہو سکتی۔''

اُس کے اس انکشاف سے ہر طرف موت کا سا سناٹا طاری ہو گیا۔ ہر ایک کی زبان پر جیسے تالا پڑ گیا اور ہر شخص نظریں جھکائے کھڑا رہا۔ لگا جیسے وہ گھٹنوں گھٹنوں تک پانی میں ڈوب گئے ہوں۔ ایسا تھا وہ پگلا گلو اور ایسے تھے میرے گاوں کے لوگ۔



جب امبر روئے

فتح محمد اپنے آپ کو مہذب کہتا تھا مگر سچ تو یہ تھا کہ وہ ایکدم اُجڈ گنوار تھا۔ اُسکی سرشت سے وحشی جبلت کا کا سایہ اب تک نہیں ٹلا تھا۔ وہ آج بھی ایک وحشی انسان کی طرح جی رہا تھا جسکے دل میں دیا دھرم نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ جسے دوسروں کو اذیتیں پہونچانے میں مزہ آتا ہے۔ جو کسی مظلوم پر ظلم ڈھانا بہادری سمجھتا ہے۔ آئے دن یہ سننے میں آتا تھا کہ آج فتح محمد نے ایک غریب آدمی کو اسلئے پیٹا کہ وہ اُسے سلام کرنا بھول گیا۔ اس مغالطے میں مت رہئے کہ فتح محمد کوئی راجہ مہاراجہ، دراوغہ یا کوتوال تھا۔ جی نہیں۔ وہ تو ایک محمولی سا حمال تھا اور مہاراج بازار میں حمالی کا کام کرتا تھا۔ یومیہ اُجرت پر کام کر کے وہ اپنے اُپ کو رانی خان کا سالا سمجھتا تھا۔ باپ نہ ماری پدڑی بیٹا تیر انداز کے مصداق وہ بڑا تیر انداز بنا بیٹھا تھا۔ بازار میں اُس نے ایسا داب بٹھا کے رکھا تھا کہ کوئی اُسکے آگے سینہ تان کے کھڑا نہیں ہوسکتا تھا۔ ہر مزدور کو وہ خدا کی کمتر اور ادنی مخلوق سمجھتا تھا۔ انسان تو انسان اُسے کتوں سے بھی خدا واسطے کا بیر تھا۔ جب بھی وہ صبح سویرے گھر سے کام پر نکلتا تھا تو ایک دو آدمیوں کے ساتھ ساتھ چار پانچ کتے بھی روز اُسکے ہاتھوں سے پٹتے تھے۔ اُسکے تابع میں جتنے بھی حمال تھے وہ سب کو ہیجڑا اور کام چور کہہ کے چڑایا کرتا تھا۔ کبھی کسی کو ٹنگڑی مار کے زمین پر پٹخ دیا۔ کبھی کسی کی چھاتی پر سوار ہو کر اُسکا دم نکالنے لگا۔ کبھی کسی کو اُٹھا کر ہوا میں اُچھال دیا۔ اُسے اپنی تنومندی پر بڑا غرور تھا۔ اسمیں شک نہیں کہ وہ بڑا تن و توش کا آدمی تھا۔ اسی توانائی کی وجہ سے وہ کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ وہ چاہے امرتسر کا تھوک بیوپاری پرس رام ہو یا چائے

ن کا ہول سیلر خالق جو۔ طرفہ یہ کہ جن کا وہ کھاتا تھا اُن پر ہی وہ غراتا تھا۔ سارا دن وہ ان ہی کی دکان کے ھڑے کے آگے ٹانگیں پھیلائے پڑا رہتا تھا۔ جب چائے پینے کو دل کرے تو لونڈے کو چائے کے لئے واز دیتا اور بل مالکوں سے بھروا دیتا تھا۔ چونکہ وہ حمالوں کا ہیڈ تھا اسلئے کوئی اُس سے پنگا لینا نہیں چاہتا ھا۔ جب اُسکا حکم ہوتا تھا دلی یا امرتسر سے آنے والا ٹرک سے مال اُتارا جاتا تھا۔ کس مائی کے لال میں اتنا م تھا جو حکم عدولی کر پاتا۔ اب اگر کسی بھی ڈرائیور نے زرا سی دادا گیری دکھانے کی کوشش کی تو اُسے اُسکا خمیازہ بھگتنا پڑتا تھا۔ اُسکا ٹرک ہفتوں کھڑے کا کھڑا رہ جاتا تھا اور وہ ایک ایک کو دہائی دے کے تھک جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کوئی بھی بیوپاری فتح سے رشتے بگاڑنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ وہ بڑا کم ظرف اور خسیس قسم کا آدمی تھا۔

ایک دن اُسنے اپنے ہی گاؤں کے ایک لونڈے کو ہیجڑا ہیجڑا کہہ کے خوب دوڑایا۔ جب وہ روتے بسورتے اپنی ماں کے پاس پہونچا تو بچے کو روتے دیکھ کر ماں کی چھاتی پھٹنے لگی۔ اُسنے اپنے لال کو سینے سے لگا کے جب رونے کا سبب پوچھا تو بچے نے ماں کو سارا قصہ بے کم و کاست سنا ڈالا۔ عورت کے تن بدن میں آگ لگی اور وہ منہ سے آگ اُگلتے ہوئے گھر سے نکلی اور سیدھے فتح کے گھر پہونچی ۔ اُس نے فتح محمد کو کھڑے کھڑے ہی خوب کوسنے دیئے، تبرے پڑھے اور ساتھ ہی اُسے یہ بددعا بھی دی کہ جب اُسکے یہاں بیٹا پیدا ہو تو وہ ہیجڑا نکلے۔ فتح کا خون کھولا پر وہ کچھ کر نہ سکا بس پیتا مار کے بیٹھ گیا۔ آدمی کتنا بھی دبنگ ہو عورت کے آگے وہ اپنے سارے پنجے چھکے بھول جاتا ہے۔

کہتے ہیں کہ بتیس دانت کی بانکا خالی نہیں جاتی۔ کسی کے دل سے کبھی آہ ضرور نکلی ہوگی ، جس نے اپنا اثر دکھایا۔ جب فتح کے یہاں پہلوٹھی کا بچہ ہوا تو وہ مقررہ وقت سے دو مہینے پہلے پیدا ہو۔ یعنی سات ماسی بچہ۔ پیدائش کے وقت دائی بھی یہ پتا نہ لگا سکی کہ یہ بچہ مرد ہے یا زنخا۔ وہ جب گرتے ٹھلتے کھیلنے کودنے کے لائق ہو گیا تب اُسکے ہاو بھاو سے یہ شبہ ہونے لگا کہ اسمیں کچھ خرابی ہے۔ نام تو اُسکا علی محمد رکھا گیا مگر وہ حرکتیں لڑکیوں جیسی کرتا تھا۔ لڑکیوں کی طرح اپنے پاوں میں پازیب پہننے کی ضد کرتا تھا۔ اُنہی کے جیسے کپڑے پہننے کی فرمائش کرتا۔ اُسکی اماں تو کوڑھ مغز تھی۔ اُسے ان سب باتوں کا کوئی ادراک نہ

جب امیر روئے

فتح محمد اپنے آپ کو مہذب کہتا تھا مگر سچ تو یہ تھا کہ وہ ایکدم اُجڈ گنوار تھا۔ اُسکی سرشت سے وحشی جبلت کا کا سایہ اب تک نہیں ٹلا تھا۔ وہ آج بھی ایک وحشی انسان کی طرح جی رہا تھا جسکے دل میں دیا دھرم نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ جسے دوسروں کو اذیتیں پہونچانے میں مزہ آتا ہے۔ جو کسی مظلوم پر ظلم ڈھانا بہادری سمجھتا ہے۔ آئے دن یہ سننے میں آتا تھا کہ آج فتح محمد نے ایک غریب آدمی کو اسلئے پیٹا کہ وہ اُسے سلام کرنا بھول گیا۔ اس مغالطے میں مت رہیئے کہ فتح محمد کوئی راجہ مہاراجہ، دراوغہ یا کوتوال تھا۔ جی نہیں۔ وہ تو ایک معمولی سا حمال تھا اور مہاراج بازار میں حمالی کا کام کرتا تھا۔ یومیہ اُجرت پر کام کر کے وہ اپنے اُپ کو رانی خان کا سالا سمجھتا تھا۔ باپ نہ ماری پدڑی بیٹا تیر انداز کے مصداق وہ بڑا تیر انداز بنا بیٹھا تھا۔ بازار میں اُس نے ایسا داب بٹھا کے رکھا تھا کہ کوئی اُسکے آگے سینہ تان کے کھڑا نہیں ہوسکتا تھا۔ ہر مزدور کو وہ خدا کی کمتر اور ادنی مخلوق سمجھتا تھا۔ انسان تو انسان اُسے کتوں سے بھی خداواسطے کا بیر تھا۔ جب بھی وہ صبح سویرے گھر سے کام پر نکلتا تھا تو ایک دو آدمیوں کے ساتھ ساتھ چار پانچ کتے بھی روز اُسکے ہاتھوں سے پٹتے تھے۔ اُسکے تابع میں جتنے بھی حمال تھے وہ سب کو ہیجڑا اور کام چور کہہ کے چڑایا کرتا تھا۔ کبھی کسی کو ٹنگڑی مار کے زمین پر پٹخ دیا۔ کبھی کسی کی چھاتی پر سوار ہو کر اُسکا دم نکالنے لگا۔ کبھی کسی کو اُٹھا کر ہوا میں اُچھال دیا۔ اُسے اپنی تنومندی پر بڑا غرور تھا۔ اسمیں شک نہیں کہ وہ بڑا تن و توش کا آدمی تھا۔ اسی توانائی کی وجہ سے وہ کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ وہ چاہے امرتسر کا تھوک بیوپاری پرس رام ہو یا چائے

پتی کا ہول سیلر خالق جو۔ طرفہ یہ کہ جن کا وہ کھاتا تھا اُن پر ہی وہ غراتا تھا۔ سارا دن وہ ان ہی کی دکان کے تھڑے کے آگے ٹانگیں پھیلائے پڑا رہتا تھا۔ جب چائے پینے کو دل کرے تو لونڈے کو چائے کے لئے آواز دیتا اور بل مالکوں سے بھروا دیتا تھا۔ چونکہ وہ حمالوں کا ہیڈ تھا اسلئے کوئی اُس سے پنگا لینا نہیں چاہتا تھا۔ جب اُسکا حکم ہوتا تھا دلی یا امرتسر سے آنے والا ٹرک سے مال اُتارا جاتا تھا۔ کس مائی کے لال میں اتنا دم تھا جو حکم عدولی کر پاتا۔ اب اگر کسی بھی ڈرائیور نے زرا سی دادا گیری دکھانے کی کوشش کی تو اُسے اُسکا خمیازہ بھگتنا پڑتا تھا۔ اُسکا ٹرک ہفتوں کھڑے کا کھڑا رہ جاتا تھا اور وہ ایک ایک کو دہائی دے کے تھک جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کوئی بھی بیوپاری فتح سے رشتے بگاڑنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ وہ بڑا کم ظرف اور خسیس قسم کا آدمی تھا۔

ایک دن اُسنے اپنے ہی گاوں کے ایک لونڈے کو ہیجڑا ہیجڑا کہہ کے خوب دوڑایا۔ جب وہ روتے بسورتے اپنی ماں کے پاس پہونچا تو بچے کو روتے دیکھ کر ماں کی چھاتی پھٹنے لگی۔ اُسنے اپنے لال کو سینے سے لگا کے جب رونے کا سبب پوچھا تو بچے نے ماں کو سارا قصہ بے کم و کاست سنا ڈالا۔ عورت کے تن بدن میں آگ لگی اور وہ منہ سے آگ اُگلتے ہوئے گھر سے نکلی اور سیدھے فتح کے گھر پہونچی ۔ اُس نے فتح محمد کو کھڑے کھڑے ہی خوب کوسنے دئے، تبرے پڑھے اور ساتھ ہی اُسے یہ بددعا بھی دی کہ جب اُسکے یہاں بیٹا پیدا ہو تو وہ ہیجڑا نکلے۔ فتح کا خون کھولا پر وہ کچھ کر نہ سکا بس پتا مار کے بیٹھ گیا۔ آدمی کتنا بھی دبنگ ہو عورت کے آگے وہ اپنے سارے پنجے چھکے بھول جاتا ہے۔

کہتے ہیں کہ بتیس دانت کی بانکا خالی نہیں جاتی۔ کسی کے دل سے کبھی آہ ضرور نکلی ہوگی ، جس نے اپنا اثر دکھایا۔ جب فتح کے یہاں پہلوٹھی کا بچہ ہوا تو وہ مقررہ وقت سے دو مہینے پہلے پیدا ہو۔ یعنی سات ماسی بچہ۔ پیدائش کے وقت دائی بھی یہ پتا نہ لگا سکی کہ یہ بچہ مرد ہے یا زنخا۔ وہ جب گرتے ٹھلیتے کھیلنے کودنے کے لائق ہو گیا تب اُسکے ہاو بھاو سے یہ شبہ ہونے لگا کہ اسمیں کچھ خرابی ہے۔ نام تو اُسکا علی محمد رکھا گیا مگر وہ حرکتیں لڑکیوں جیسی کرتا تھا۔ لڑکیوں کی طرح اپنے پاوں میں پازیب پہننے کی ضد کرتا تھا۔ اُنہی کے جیسے کپڑے پہننے کی فرمائش کرتا۔ اُسکی اماں تو کوڑھ مغز تھی۔ اُسے ان سب باتوں کا کوئی ادراک نہ

تھا۔وہ بیٹے کی موہ میں ایسے پڑ چکی تھی کہ وہ جس چیز کی ضد کرتا تھا وہ پوری کر دیتی تھی۔اماں میرا جوڑا بنا دو تو وہ جوڑا بنا دیتی تھی۔میری آنکھوں میں کاجل ڈالو تو وہ کاجل ڈال دیتی تھی۔فتح نے تو سات گھاٹ کا پانی پیا تھا۔بیٹے کی ان حرکتوں سے اُسنے بھانپ لیا کہ کہیں نہ کہیں کچھ گڑ بڑ ہے۔وہ اُسے ایک دن حکیم کے پاس لے گیا۔حکیم نے اُسکی روداد سنی بچے کا معائنہ کیا اور اُسے یہ کہہ کر اُلٹے پاوں لوٹا دیا کہ قدرت کے کھیل میں انسان کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔

فتح کو اس انکشاف سے اتنا گہرا صدمہ لگا کہ گھر آکر جو وہ گرا تو پھر کبھی اُٹھ نہیں پایا۔ایک سال تک صاحب فراش رہنے کے بعد ایک دن اُسکی موت ہوئی۔اُسکی موت پر کسی نے افسوس ظاہر نہیں کیا۔لوگ تو ایسے موذی کے چلے جانے سے راحت محسوس کر رہے تھے۔چند ایک تو دبے لفظوں میں یہ بھی کہتے سنے گئے۔خس کم جہاں پاک ہوگیا۔بیچاری عورت اکیلی کیا کر پاتی۔گھر میں کوئی قارون کا خزانہ تو دھرا نہیں پڑا تھا جس کے سہارے زندگی چل پاتی۔فتح تو یومیہ مزدوری کرتا تھا۔جو کچھ بھی پس انداز کر کے رکھا تھا وہ کئی مہینوں میں صاف ہوگیا۔آگے گھر کیسے چلے گا یہ فکر علیا کی ماں کو اندر ہی اندر گھن کی طرح کھاتی جارہی تھی۔وہ چرخہ پونی کر کے دو پیسے کما لیتی تھی۔ایک دن وہ بھی بیٹھے بیٹھے چت ہوگئی۔اپنی کہی نہ اور کی سنی۔بس چھوڑ گئی علیا کو روتے بلکتے۔تب علیا کی عمر گیارہ سال کی تھی۔علیا یتیم ہوگیا تھا۔اُسکا کوئی نہیں تھا۔وہ اکیلا اور تنہا تھا۔گاوں میں ایک متمول آدمی نے ترس کھا کر اس یتیم کو اپنے گھر میں پناہ دی۔اصل میں اُسکے گھر ایک بیٹا پیدا ہوا تھا۔اُسی کی دیکھ ریکھ کے لئے اُسنے علیا کو اپنے گھر میں لا کے رکھ دیا۔علیا کو جینا تھا اسلئے وہ کام کرنے کے لئے تیار ہوگیا۔وہ بچے کا بول براز اُٹھاتا۔اُسکے چوتڑ دھوتا۔اُسکے کپڑے بدلتا۔اُسے نہلاتا۔اُسے دودھ پلاتا۔کبھی بچہ چڑھی دینے کے لئے کہتا تو وہ گھوڑا بن جاتا تھا۔کبھی بڑے بلاتے تو وہ اُن کے چرنوں میں ہوتا تھا۔غرض علیا وہ سارے کام کرتا تھا جو ایک دائی ،ایک باندی کرتی ہے۔گھر والے اُسکے کام سے خوش تھے کیونکہ وہ بچے کا ایسا خیال رکھتا تھا جیسے یہ بچہ اُسکا ماں جایا ہو۔بدلے میں اُسے دو وقت کی روٹی ملتی تھی جسے وہ نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں سمجھتا تھا۔برسوں وہ اسی طرح لوگوں کی سیوا ٹہل کر کے اپنی گاڑی چلاتا رہا۔

علیا کسی کے لئے آدھا مرد تھا اور کسی کے لئے آدھی عورت۔ وہ نہ قدرت کے اس ستم سے شاکی تھا اور نہ ہی اُسے اپنی قسمت سے کوئی گلہ تھا۔ اُسنے اس روپ میں اپنے آپ کو قبول کیا تھا۔ وہ عورتوں کی طرح ہی بولتا تھا۔ عورتوں کی طرح ہی چلتا تھا۔ وہی ادائیں اور وہی عشوے۔ اُسکے انہی حرکات وسکنات سے مظہر تھا کہ وہ زنخا ہے۔ اس طرح کے لوگوں کے ساتھ عورتیں بہت جلد ہل مل جاتی ہیں۔ ایسے نامردوں کی سنگت میں وہ اپنے آپ کو محفوظ و مامون محسوس کرنے لگتی ہیں۔ اُسے بھی مردوں سے زیادہ عورتوں کی صحبت میں رہنا پسند تھا۔ جب عورتیں اُسے گھیر لیتیں اور اُس سے چہل کرنے لگتی تھیں تو وہ بھی دل لگی پہ اُتر آتا تھا اور عورتوں کو خوب ہنساتا تھا۔ عورتیں اس سے اسلئے اسقدر مانوس تھیں کہ وہ اُنہیں اپنی طرح ہی لگتا تھا۔ وہ تھا تو جوان مگر باتیں بڑے بزرگوں کی طرح کیا کرتا تھا۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو جوان عمری میں ہی زیرک بن جاتے ہیں اور اپنی خردمندی کا لوہا منوانے لگتے ہیں۔ علیا اُن میں سے ایک تھا۔ اُسکے تعلقات صنف نازک سے اس حد تک گہرے تھے کہ جن پوشیدہ بیماریوں کو اپنے شوہر سے بیان کرنے میں ہچکچاتی تھیں اُنہی بیماریوں کا ذکر وہ بنا کسی لجا کے علیا سے کرتی تھیں۔ کسی کا حمل نہیں ٹھہر پا رہا ہے۔ کسی کی ماہواری میں گڑبڑی ہو رہی ہے۔ کسی کا مرد پوچھتا نہیں ہے۔ علیا کی زنبیل میں ہر مسلے کا توڑ تھا۔ ہر مرض کی دوا تھی۔ وہ کسی خرانٹ کی طرح ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر بڑے انہماک سے ہر عورت کا دکھڑا سنتا تھا اور پھر اُسکا توڑ بتا دیتا تھا۔ اُسے کس ڈاکٹر سے جا کر ملنا چاہے، کونسی بوٹی کب کھانی چاہے، کس چیز کو ترک کر دینا چاہے ان سب چیزوں کا اُسے ادراک تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس گاوں کی بیشتر عورتوں کا مونس، غمخوار اور ہمراز تھا۔

وہ شکل وصورت سے مرگھلے چوہے کی طرح لگتا تھا۔ شاید یہ بھی اُسکے باپ کی کرنیوں کا پھل تھا۔ کچھ لوگ اُسے مرزا پھوئیا کہتے تھے۔ سانولا رنگ، سوکھا بدن، دھنسی ہوئی آنکھیں، نازک بدن۔ وہ جوان تھا مگر جوانی کی کوئی اُمنگ ترنگ اُسکے اندر ہلکورے نہیں مار رہی تھی۔ وہ ایک خاموش جھیل کی طرح تھا جس میں نہ لہروں کا تموج تھا اور نہ ہی کوئی جل ترنگ۔ ایک تو وہ ستم کا مارا تھا اوپر سے غریب اور یتیم، ماں باپ اُسکے لئے سوائے بھوک اور بدنصیبی کے کچھ چھوڑ کے نہیں گئے تھے۔ وہ بس حالات کی

ٹھوکروں میں صدا پڑا رہتا تھا۔ نہ جانے کب حالات اُسے کس اور دھکیل دیں۔ وہ اب تک بیس ہانڈیوں کا مزہ چکھ چکا تھا۔ ایک دن وہ اسی گاوں کے ایک پنڈت گھرانے تک پہونچ گیا جہاں اُسے کام کرتے ہوئے بڑا سکون ملا۔ سقے کی طرح اُسکا کام چشمے سے پانی بھر کے لانا ہوتا تھا۔ وہ عورتوں کی طرح سر پر مٹی کا گھڑا رکھ کر خرام ناز کے ساتھ چشمے پر چلا جاتا تھا اور وہاں بیٹھی عورتوں کے ساتھ اپنا گھڑا بھرتا تھا اور پھر یہ گھڑا صاحب مالک کاشی ناتھ کی بیوی لیلا کو تھما دیتا تھا۔ وہ دن میں بیسوں بار پانی کے گھڑے بھر بھر کے لے آتا تھا۔ اُن دنوں نلکے ندارد تھے۔ پانی کی سپلائی کا زریعہ انسانی کاندھے ہی ہوا کرتے تھے۔ جو آسودہ حال تھے وہ یہ کام نوکروں سے کروایا کرتے تھے اور جو متوسط طبقے کے لوگ تھے، وہاں گھر کی عورتیں یہ کام کیا کرتی تھیں۔ علیا دیکھنے میں وہ مریل سا لگتا تھا مگر اُسکے اندر کافی دم خم تھا۔ بیسوں چکر لگانے کے بعد وہ تھکتا نہیں تھا۔ جب دیکھو پھیرے کی طرح سرپٹ بھاگے چلا جارہا ہے۔ ہٹے کٹے مشٹنڈے بھی اُسکی توانائی دیکھ کر رشک کھانے لگتے تھے۔ وہ حیران تھے کہ وہ کونسی چکی کا پِسا آٹا کھاتا ہے جو وہ تھکتا ہی نہیں ہے۔

پنڈت کاشی ناتھ اس قریئے کا اچھا خاصا جاگیردار تھا۔ انہوں نے گھر میں کئی نوکر طلب پر رکھے تھے۔ کوئی ڈنگر پالنے کے لئے مقرر تھا تو کوئی کھیتی باڑی کے لئے۔ علیا ان سب میں سے یکتا تھا۔ وہ دل کا راجہ تھا۔ اُسکا اپنا کوئی نہ تھا۔ ماں نہ باپ، بھائی نہ بہن پر اکیلا ہو کے بھی وہ اپنے آپ کو اکیلا محسوس نہیں کرتا تھا۔ اُسے سبھی اپنے لگتے تھے۔ جہاں وہ کام کرتا تھا اُس گھر کا ہر فرد اُسے اپنے پریوار کا حصہ لگتا تھا۔ اُسکا من صاف تھا، نظر پاک تھی۔ آجتک کسی نے اُسکے کردار پر اُنگلی نہیں اُٹھائی تھی۔ نو بیاہتا اپنی بیویوں کو علیا کے بھروسے چھوڑ کر گھر سے باہر جاتے تھے۔ وہ پیار کا ہلکورے مارتا ساگر تھا۔ ماماتا اور اپنائیت کا پیکر۔ محبت کی حلاوت جیسے اُسکی فطرت میں گھلی ہوئی تھی۔ وہ اُس بادل کی طرح تھا جو رحمت باراں برسا کر کسی پہاڑ کی پھننگ پر بیٹھ کر ستانے لگتا ہے۔ وہ بھی جہاں کسی کو دکھی دیکھتا تھا تو اُسکا دکھ ودرد کم کرنے کی کوشش ضرور کرتا تھا۔ اُسے دوسروں کے دکھ ودرد اپنے سے لگتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سب کا محبوب تھا۔ سب لوگ اُس سے پیار کرتے تھے۔

کاشی ناتھ کا ایک بھرا پرا پریوار تھا۔ایک بیٹا اور تین بیٹیاں ۔چاروں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔دو بیٹیاں سری نگر میں بیاہی گئی تھیں جب کہ ایک بیٹی پڑوس کے گاوں ٹھکانے لگ گئی تھی۔تینوں بیٹیاں اپنے اپنے سسرال میں خوش تھیں جب کہ اُسکے اپنے گھر میں اشانتی تھی۔اس اشانتی کی وجہ گھر میں ہر سال پیدا ہونے والی بیٹیاں تھیں۔بیٹا بال کشن جو کہ چاورں اولاد میں سب سے بڑا تھا تین تین بیٹیوں کا باپ بن چکا تھا۔ان بیٹیوں کو دیکھ کے اُنکی دادی لیلا ہر دم کڑھتی رہتی تھی۔بال کشن کی بیوی جو کہ ایکدم لکڑی سی تھی ایک بار پھر اُمید سے تھی۔اپنی بہو پھولا کا اُبھرا ہوا پیٹ دیکھ کر کبھی لیلا کی باچھیں کھل جاتی تھیں تو کبھی اُسکا دل بیٹھا جانے لگتا تھا۔اصل میں وہ بال کشن کی تین تین بیٹیوں کو دیکھ کر وہ اسقدر آزردہ اور دل سوختہ تھی کہ چوتھی بار بھی بہو کی کوکھ میں اُسے بیٹی ہی نظر آرہی تھی۔اس بار لیلا نے قسم کھائی تھی کہ وہ ایک اور بیٹی کو اس گھر میں جنم لینے نہیں دے گی۔اُسنے پوتے کا منہ دیکھنے کے لئے کمر کس لی۔قرب و جوار میں جتنے بھی آستانے تھے،وہ سب جگہ دھاگہ باندھ کے آئی تھی۔جہاں کوئی سادھو فقیر نظر آیا اُن کے سامنے جھولی پھیلائی اور اُنہیں منا کر اُن سے گنڈے تعویذ لے کے آئی۔پوتا ہوا تو کھیر بھوانی میں یگیہ کرانے کی منت بھی مانگ کے آئی تھی۔کاشی ناتھ بھی پوتے کا منہ دیکھنے کے لئے ترس رہا تھا پر وہ اپنا دکھ اپنے من میں چھپا کے بیٹھا تھا۔اُسکی بڑی آرزو تھی کہ وہ جیتے جی پوتے کا منہ دیکھ سکے مگر دینے والا تھا ایشور تھا۔بس اُسی کو منانے وہ سویرے سویرے پاس کے مندر میں جاتا تھا اور گھنٹوں پوجا اُپاسنا کرتا رہتا تھا۔

آخر وہ گھڑی آہی گئی۔۔پھولا دردزہ سے تڑپنے لگی۔علیا کو دائی بلانے کے لئے دوڑایا گیا۔وہ خطجی دائی کو پکڑ کر لے آیا۔گاوں میں ایک خطجی دائی تھی جو جنائی کا کام کرتی تھی۔لیلا کا تو دل اوپر تلے ہوا جا رہا تھا۔وہ بڑی بے چینی سے کمرے کے باہر ٹہل رہی تھی اور خوشخبری سننے کے لئے مری جا رہی تھی۔دفعتاً بچے کے رونے کی آواز آئی۔وہ لشتم پشتم جو دروازے تک پہونچ گئی تو اندر کی خبر سن کر وہ دھم سے نیچے بیٹھ گئی۔پھولا نے اس بار بھی بیٹی کو ہی جنم دیا تھا۔لیلا کی ساری محنت اکارت گئی تھی۔سارے گنڈے تعویذ بے اثر ثابت ہوئے تھے۔اُسکا جی کر رہا تھا کہ وہ چھاتی پیٹ پیٹ کر روئے۔تین سیاہ سر والی پہلے سے ہی اُس کی چھاتی پر سوار تھیں۔اب اس چھوتی کو وہ کہاں بٹھادے۔جب خطجی دائی چلی گئی اور گھر

میں اپنے پریوار کے علاوہ بس ایک علیا رہ گیا تو لیلا دہاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ گھر کے ہر فرد نے اُسے چپ کرانے کی کوشش کی مگر وہ مسلسل روتی رہی۔ وہ ایک ہی ولاپ کر رہی تھی کہ وہ اس لڑکی کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتی ہے۔ وہ تب ہی رونا بند کرے گی جب اس لڑکی کو اس گھر سے دفا کیا جائیگا۔ پھولا بھی نادم وپشیمان بن کے بیٹھی تھی۔ اُسے اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ چار چار بیٹیوں کو پالنا آسان نہیں۔ ان کے داج دہیز کو اکھٹا کرنے میں آدھی زندگی نکل جائے گی۔

تھوڑی دیر بعد لیلا نے چنڈی کا روپ دھارن کر لیا۔ اُسنے اپنے شوہر سے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ ابھی جا کے اس لڑکی کو مار ڈالو۔ کوئی پوچھے تو کہہ دیں گے کہ مرگئی۔ علیا بھی مغموم ہو کے بیٹھا تھا۔ لیلا کو اس بات کا کوئی ڈر نہیں تھا کہ وہ یہ باتیں علیا کے سامنے کر رہی ہے۔ وہ علیا کو اسی گھر کا ایک فرد سمجھتے تھے۔ وہ مرسکتا تھا لیکن کبھی نمک حرامی نہیں کرسکتا تھا۔ لیلا نے بال کشن سے پوچھا تو بال کشن روتے ہوئے بولا۔

''میرا تو نصیب ہی کھوٹا ہے۔ پہلے کی تین سے تو کمر دوہری ہوگئی تھی۔ اب اسکے آنے سے تو کمر بالکل ٹوٹ گئی ہے۔ ہم دونوں مرتے دم تک کبھی سینہ تان کے کھڑے نہیں ہو پائیں گے۔ ہر دم اپنے سمبندھیوں کے سامنے سر جھکائے کھڑے رہیں گے۔ تم ٹھیک کہہ رہی ہو ماں۔ اس بچی کو دفا کر دو یہاں سے۔ ابھی جائے گی تو زیادہ تکلیف نہیں ہوگی۔ کچھ دن رہے گی تو ہم سب کو موہ مایا میں اُلجھا دے گی۔ پھر ہم اسے اپنے آپ سے الگ نہیں کر پائیں گے''

کاشی ناتھ جو بہت دیر سے خاموش بیٹھا تھا، لیلا کی طرف مڑ کر بولا۔

''پر یہ نردھیہ کام کرے گا کون؟''

لیلا نے علیا کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''علیا ہے نا''

علیا نے اثبات میں فوراً سر ہلایا جیسے وہ یہ کام کرنے کے لئے پہلے سے تیار بیٹھا ہو۔ علیا نرم ونازک ضرور تھا مگر وہ اندر سے کمزور نہیں تھا۔ ابتدا میں جس گھر میں کام کرتا تھا وہاں ہر روز وہ بازار سے مرغے خرید کے لاتا تھا اور اُنہیں اپنے ہاتھوں سے ذبح کر دیتا تھا۔ بقرعید پر اُسنے اپنے ہاتھوں

سے ایک بکرے کو حلال کیا تھا۔ وہ چاقو چھری چلانے سے گھبراتا نہیں تھا۔ اُسے یہ ایک دن کی لڑکی بھی کسی مرغی یا کسی میمنے کی طرح ہی لگ رہی تھی جس کو ٹھکانے لگانا اُسکے لئے اتنا مشکل تو نہیں تھا۔ اُسنے سوچا کہ یہی تو موقع ہے کہ وہ جان نثاری کا ثبوت دے کے ان لوگوں کی آنکھوں میں سما جائے۔ کاشی ناتھ تو بڑی دگدھا میں تھا۔ اُسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے کیا کہے۔ دل و دماغ جیسے ماوف ہو چکا تھا۔ کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا پھر بھی اُس نے اپنے آپ کو مطمعن کرنے کے لئے لیلا سے کہا۔

''اس سے پوچھ لو کیا یہ کام کرے گا؟''

''ارے اس موئے نے اس گھر کا نمک کھایا ہے۔ کیا اس گھر کی بھلائی کے لئے وہ اتنا سا کام بھی نہیں کر پائے گا۔''

''اطمینان رکھو لیلا چاچی میں یہ کام ضرور کروں گا۔ ارے اس پاؤ بھر کی چھوکری کو ٹھکانے لگانا کوئی بڑا مسلہ نہیں۔ زرا سا اسکا ٹیٹوا دبا دیا تو قصہ ختم''

لیلا نے خوش ہو کر انٹی میں سے دو سو نکالے اور علیا کو دو سو روپے دیکر وہ بچی کو اُٹھا کر لائی اور اسے علیا کی گود میں ڈالتے ہوئے بولی۔ ''تم نے برسوں اس گھر کا نمک کھایا ہے۔ اب اس گھر کی سکھ و شانتی کے لئے یہ نیک کام کر دے۔ اس جنم جلی کو ہمارے سر سے اُتار دے۔ اسے کہیں پھینک کے آجا۔ کوئی پوچھے تو کہہ دینا کہ اچانک مر گئی۔''

پھولا اپنی ساس سے اسقدر دبی ہوئی تھی کہ وہ اس بے رحم فیصلے پر ایک اُف تک نہ کر سکی۔ گھر کے سبھی افراد منہ میں گھنگھیاں بھر کے بیٹھے رہے۔ بال کشن تو ماں کے کہنے میں تھا اسلئے اُسکی طرف سے کسی مدافعت کی کوئی توقع نہیں تھی۔ اُسکا شوہر بھی بیوی کے کہنے پر چلتا تھا۔ اب اس معصوم بچی کی زندگی علیا کے ہاتھ میں تھی۔ وہ اس بچی کو لے کے اُٹھا اور رات کے اندھیارے کو چیرتا ہوا نکل گیا۔

چلتے چلتے علیا کے پاؤں ڈگمگانے لگے۔ جس جوش کے ساتھ اُسنے اس بچی کو ٹھکانے لگانے کی حامی بھری تھی باہر آکر وہ کمزور پڑھنے لگا۔ ایک دن کا یہ گوشت کا لوتھڑا علیا کے سینے سے چمٹا ہوا تھا اور اُسکی چھاتیوں میں زندگی کے اُس امرت کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو وہاں تھا ہی نہیں۔ اس کے

ہاتھوں کے لمس نے علیا کے اندر چھپی ہوئی عورت کو جگا دیا۔ علیا کو لگا جیسے اس گوشت کے لوتھڑے نے اُسکے سوئے ہوئے جذبات کو جگا کر اُن میں ایک نئی حرارت اور لذت بھر دی ہو۔ اُسے لگا جیسے اُفتادہ پڑی دھرتی پر میگھ کی بوندیں گری ہوں۔ جیسے یہ گوشت کا لوتھڑا، محض ایک گوشت کا لوتھڑا نہ ہو بلکہ باد بہاری کا پہلا جھونکا ہو جو اُجاڑ پڑی دھرتی کو نئی رونق بخشتی ہے، جو اسے گل وگلزار بنا دیتی ہے۔۔ علیا کے اندر ایک ہل چل مچی ہوئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس بچی نے اُسکے اندر اُتھل پتھل مچا دی ہو۔ جیسے اس ننھی سی جان نے اُسکے دل کے بند پڑے دروازے وا کئے ہوں۔ جیسے اُسنے اُسکے اندر خفتہ پڑی مامتا کے سبھی سوتے جگا دئے ہوں۔ جیسے پیار ومحبت کے سارے خاموش ساز اُسنے اپنے کومل ہاتھوں سے ایک ساتھ چھیڑ دئے ہوں۔ اُسنے اُسے اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا اور پھر وہ نیچے بیٹھ کر رونے لگا۔

رات بڑی تاریک اور ہولناک تھی۔ ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی۔ پتے اُسی طرح کانپ رہے تھے جیسے علیا کا دل کانپ رہا تھا۔ بار بار وہ اس معصوم کو سینے کے ساتھ بھینچ لیتا تھا جسمیں زندگی کی دھڑکن تھی۔ دفعتاً بجلی چمکی۔ علیا نے اس چکا چوند میں اس معصوم کا چہرہ کیا دیکھا اُسے لگا جیسے یہ انسانی بچہ نہیں بلکہ ایک کلی ہے جو ابھی چٹکی ہو۔ ایک غنچہ ہے جو ابھی ابھی کھلا ہو۔ وہ کیوں اس معصوم کی جان لے؟ آخر اس کا قصور کیا ہے۔ وہ خود اس دنیا میں نہیں آئی۔ اُسے تو قدرت نے اس دھرتی پر بھیجا۔ ابھی اُس نے پوری طرح اپنی آنکھیں بھی نہیں کھولی ہیں۔ وہ اس دنیا کی عیاری کو کہاں سمجھ پاتی۔ انسان کی خود غرضی کو کہاں پہچانتی۔ وہ تو فرشتے کی طرح پاک اور معصوم تھی۔ اُسے کیا پتا تھا کہ یہ سماج کتنا بے رحم اور نردھے ہے۔ اُسے کیا خبر کہ بیٹی بن کے پیدا ہونا کتنا بڑا گناہ ہے؟

علیا عجب گومگو کی حالت میں تھا۔ وہ کیا کرے، کیا نہیں کرے اُسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اگر وہ اس بچی کو زندہ چھوڑ دے گا تو وہ سارا اعتماد کھو دیگا اور اُس سے وہ آشیانہ بھی چھن جائے گا جہاں رہ کر اُسے ایک نئی زندگی ملی تھی۔ اگر اُس نے اس بچی کی جان لی تو وہ ایک عظیم گناہ کر بیٹھے گا اور محشر کے روز اُسے جواب دینا ہوگا۔ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ اسی کشمکش سے دو چار تھا تبھی اُسکے چہرے پر تیز روشنی پڑی جس سے اُسکی آنکھیں چندھیا گئیں اور ایک پل کے لئے اُسکے دل کی دھڑکن رک گئی۔

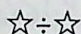
اُسے لگا کہ وہ پولیس کی گرفت میں آچکا ہے۔وہ بدحواسی کے عالم میں سامنے کھڑے آدمی سے ٹکرایا۔اچانک ایک سہمی سی نسوانی آواز اُسکی سماعت سے ٹکرائی۔

''علیا ڈرمت۔یہ میں ہوں''

یہ آواز پھولا کی تھی۔اُسکے ہاتھ میں ایک پوٹلی تھی۔اُسنے وہ پوٹلی علیا کو تھما دی جسمیں روپے پیسے کے علاوہ اُسکے سارے زیور تھے۔اُسنے بڑھکر اپنی بچی کو دیوانہ وار چوما۔وہ اُسے چومتی بھی رہی اور روتی بھی رہی۔علیا ابھی تک ہیبت کے عالم میں تھا۔اپنی بیٹی کو چومنے چاٹنے کے بعد وہ اشکوں کے سیلاب کو روکتے ہوئے بس اتنا ہی بول پائی۔

''میں جارہی ہوں۔اس کا خیال رکھنا''

کہہ کر پھولا اندھیارے میں کہیں غائب ہوگئی۔علیا نے بچی کو زور سے بھینچ لیا اور پھر وہ ایک نئے ولولے اور جوش کے ساتھ ایک انجانی منزل کی جانب چل پڑا۔



لانس نائیک فتح محمد

کل تک اُسے کوئی جھوٹوں بھی نہیں پوچھتا تھا۔کسی کے پاس بیٹھنے کی کوشش کرتا تو وہ اُسے کتے کی طرح پھٹ پھٹ دردر کر کے بھگاتا تھا۔وہ اُنکی نظر میں ایک بے کار اور آوارہ لونڈا تھا جسکی گاوں میں کوئی حثیت نہ تھی۔ کہتے ہیں بارہ برس کے بعد گورے کے دن بھی پھر جاتے ہیں۔ایسا ہی کچھ فتح محمد کے ساتھ ہوا تھا۔آج گاوں میں اُسکی بڑی ساکھ اور دھاک تھی۔ یہ کایا کلپ یونہی نہیں ہوا تھا۔اس کایا کلپ کے پیچھے اُسکا تیاگ اور کڑی محنت کا کافی عمل دخل تھا۔اُسنے ایسا کچھ کر کے دکھایا تھا جو کسی کے سان گمان میں نہیں تھا۔

جس گاوں میں وہ رہتا تھا وہ کشمیر کا ایک پسماندہ علاقہ تھا۔یہاں کے باسی کھیتی باڑی کر کے اپنا گزارہ کر لیتے تھے۔اس گاوں کے چند لوگ چوتھے درجے کے سرکاری ملازم تھے۔کسی دفتر میں چپراسی یا کسی اسپتال میں خدمت گزار۔اس گاوں کا کوئی فرد بڑے عہدے پر فائز نہ تھا۔فتح محمد اسی گاوں کے ایک غریب گھر میں پیدا ہوا تھا۔یہ لوگ چکی پیس کر گزارہ کر لیتے تھے۔ جب گھر کی مالی حالت ایسی ہو تو ایسے حالات میں پڑھائی لکھائی کہاں سے ہو پاتی۔اُسکا باپ ولی محمد محنت مزدوری کر کے جو چار پیسے کما کر لاتا تھا اُسی سے گھر کا گزار ہوتا تھا جب کہ وہ دن بھر گاوں میں آوارہ گردی کرتا رہتا تھا۔گھر میں اماں کوئی کام کرنے کے لئے کہتی تو جھٹ سے کوئی بہانہ بنا کے یہ جا وہ جا جب کہ وہ گاوں والوں کے لئے ہردم حاظر رہتا تھا۔کسی کو بازار سے کوئی چیز منگانی ہوتی تھی تو اپنے پوت کو نہ کہے اُسے دوڑائے۔کسی کا ڈنگر

بھاگ گیا ہو تو فتح محمد کو اُس ڈنگر کے پیچھے لگا دیتا تھا۔ وہ ڈنگر اُسے چاہے دس کوس تک اپنے پیچھے دوڑائے مگر وہ بھی نہ جانے کس مٹی کا بنا تھا کہ جب تک وہ اُس ڈنگر کو پکڑ کے نہیں لاتا تھا اُسے چین نہیں ملتا تھا۔ وہ ہر کسی کی بے دام کی چاکری کرتا تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ کام میں زراسی ڈھلائی ہوئی تو اُسے دس باتیں بھی سننی پڑتی تھیں۔ اُسکا ظرف دیکھئے کہ مول نہ مجوری پھر بھی وہ کسی کی ڈانٹ پھٹکار کا برا نہیں مانتا تھا۔

جب اُسنے ہوش سنبھالا تو اُسکے رویے میں اچانک بدلاو آ گیا۔ جو اُسے بیوقوف سمجھتے تھے وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ فتح محمد کو انسان کی خود غرضی کا کچھ کچھ ادراک ہونے لگا تھا۔ اب کوئی اُسے مفت میں دوڑانے کی کوشش کرتا تو وہ کام کرنے کی اُجرت مانگتا تھا۔ اُسکی اس گستاخی پر اگر کوئی اُسے ڈرانے کے لئے آنکھیں بڑی کرتا تھا تو وہ بھی آنکھیں بڑی کرتا تھا کیونکہ وہ بھی بڑے دیدے کا بن چکا تھا۔ اگر کوئی اُسے برا بھلا کہتا تو وہ چپ نہیں رہتا تھا بلکہ اُسے ترکی بہ ترکی جواب دیتا تھا۔ لوگ حیران تھے کہ کل تک جس کے منہ میں زبان نہیں تھی وہ زبان چلانا کہاں سے سیکھ گیا۔ وہ یہ بھی نہیں سمجھ پائے تھا کل تک وہ جسے بیوقوف اور بدھو سمجھتے تھے وہ راتوں رات اتنا چالاک اور کمینہ کیسے بن گیا۔ وہ یہ بھول گئے تھے کہ دوسروں کی خودغرضی اور مکاری سے آدمی خود بخود سیکھ جاتا ہے۔

وہ بے فکرا اور کھلنڈرا تھا۔ وہ اپنی بھوک کھاتا اور اپنی نیند سوتا تھا۔ اُسے اس بات کی کلی فکر نہ تھی کہ کل کیا ہوگا۔ دن بھر ڈنڈ پیلنے کے بعد جب وہ گھر آتا تھا تو اماں سے ایسے کھانا مانگ لیتا تھا جیسے وہ پتھر توڑ کے آیا ہو۔ دو نوالے کھا کر وہ لمبی تان کر سوتا تھا۔ اُسکا باپ اُسکے یہ انداز دیکھ کر کڑھ کے رہ جاتا تھا۔ بات اتنی سی ہوتی تب بھی غنیمت تھا۔ دن بھر اُسکی جو کارگزاری ہوتی تھی وہ اتنی مذموم ہوتی تھی کہ کوئی اُسے یونہی بھلا نہیں سکتا تھا۔ وہ تو چھلاوہ تھا کسی کے ہاتھ لگتا نہیں تھا پر لوگ اپنا نزلہ اُسکے باپ پر گرا دیتے تھے۔ یعنی کرتا وہ تھا اور بھرتا کوئی اور تھا۔ وہ جب گاوں کے کسی لونڈے کو پیٹتا تھا تو لونڈے کا باپ اپنی جھونجل اُتارنے کے لئے اُسکے باپ کی پٹائی کر دیتا تھا۔ یعنی تازی پر بس نہ چلا ترکی کے کان اینٹھ لئے۔ اُسکے ان کرتوتوں کی وجہ سے اُسکا باپ اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے اُسے کوستا رہتا تھا۔ وہ اتنا ڈھیٹ اور سخت جان تھا کہ باپ کے کوسنوں کا اُس پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ وہ ایک کان سے سنتا تھا تو دوسرے کان

سے اُڑاتا تھا۔ اُسکا باپ اس فکر میں گھلا جا رہا تھا کہ جب کل وہ نہیں رہے گا تو اس چھوکرے کے چوچلے کون سہہ پائے گا۔ کون اسے لا کے کھلا دے گا۔ وہ تھا کہ ان سارے تفکرات سے بے نیاز اپنی زندگی جی رہا تھا۔

ایک دن جب گاوں کے ایک آدمی نے اُسکے سامنے اُسکے باپ کو تھپڑ مارا تو اُسکا خون کھول اُٹھا۔ اُس دن اُسے اپنی مفلسی اور لاچارگی کا احساس ہوا۔ مفلس نادار کی کوئی عزت نہیں ہوتی۔ جو چاہے اُسے لتاڑ سکتا ہے۔ اُسکی تھڑی تھڑی کر سکتا ہے۔ اُسنے دل ہی دل میں یہ عہد کیا کہ وہ اپنے گھر والوں کو غربت کی اس دلدل سے باہر نکال دے گا۔ وہ کچھ ایسا بن جانا چاہتا تھا کہ لوگ نہ صرف اسے عزت کی نگاہ سے دیکھیں بلکہ اُس سے دب کے بھی رہیں۔ وہ پڑھا لکھا نہیں تھا اسلئے کوئی سرکاری افسر بننے کا سوال ہی نہیں تھا۔ اپنا دھاک بٹھانے کے لئے یا تو وہ ڈاکو بن سکتا تھا یا فوجی۔ ڈاکو بن کے لوگ اُس سے خوف تو کھاتے مگر اُسے عزت نہیں دیتے۔ فوج ہی واحد ایک ایسا پیشہ تھا جسمیں ساکھ بھی تھی اور دھاک بھی۔

اُسکے چہرے پر سبزہ اُگ آیا تھا۔ ایک دن اُسنے کیا کیا۔ بازار سے ایک بلیڈ خرید کے لایا اور اپنے چہرے سے سبزہ صاف کیا۔ بس مونچھوں کو نہیں چھیڑا۔ جب وہاں بال اُگنے لگے تو اُسنے گاوں کے نائی سے دو مونچھیں بنوالیں۔ اُسکی مونچھیں دیکھ کر سب حیران ہوگئے۔ ایک پڑوسی نے اُس سے پوچھا۔

''ارے کیا ہوا۔ یہ مونچھیں کیوں بنوالیں ہیں؟''

''میں فوجی بننا چاہتا ہوں کاکا''

اس جواب سے وہ آدمی ہنس پڑا۔ اُسنے اُس پر طنز کرتے ہوئے کہا۔

''فوج کھیل کا میدان نہیں۔ وہاں محاذ پر جانا پڑتا ہے۔ دشمن سے لڑنا پڑتا ہے۔ تم نے اب تک ایک پدڑی نہیں ماری تم جنگ کے میدان میں کیا لڑو گے؟''

پڑوسی کی باتیں فتح محمد کے دل میں تیر کی طرح چبھ گئیں۔ اُسی وقت دل میں یہ عہد کر لیا کہ چاہے کچھ بھی ہو وہ فوج میں بھرتی ہو کے دکھائے گا۔ اُسنے ادھر اُدھر جا کے پتا کیا۔ کہیں کوئی مفید

معلومات ہاتھ نہیں لگیں۔ ایک دن وہ جب گھر جا رہا تھا تو اتفاق سے ایک فوجی سپاہی اُسکے سامنے سے گزرا۔ وہ ایک سردار تھا جو کہ پاس کے گاوں میں رہتا تھا۔ وہ شاید چھٹی پر آیا تھا اسلیئے بہت سارا سامان لے کے وہ گھر جا رہا تھا۔ فتح محمد اُسکے پیچھے پڑ گیا۔ وہ اُسکا سامان اُٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ فوجی نے اُسے منع کیا۔ اُسنے اُسے اس بات کی یقین دہانی کروانی چاہی کہ وہ اُس سے کوئی اُجرت نہیں لے گا بلکہ اپنی رضا سے اُسکا سامان اُسکے گھر تک پہنچائے گا سردار فوجی رک گیا اور اُسنے اُسکے سراپا کا ایک طائرانہ جائزہ لے کے پوچھا۔

''نہ تم مجھے جانتے ہو اور نہ ہی میں تمہیں پھر یہ مہربانی کس لئے؟''

فتح محمد نے بغیر کسی لاگ لپیٹ کے اُسے اپنے من کی بات سنائی۔

''سچ کہوں سردار جی، میں بھی فوج میں بھرتی ہونا چاہتا ہوں۔ یہ بھرتی کیسے ہوتی ہے میں نے بہت سارے لوگوں سے بات کی مگر کسی نے خاطر خواہ جواب نہ دیا۔ کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ میں فوج میں کیسے بھرتی ہو سکتا ہوں؟''

''فوج میں بھرتی ہونے کے لئے جگر چاہے۔ کیا تم میں وہ جگرا ہے کیا؟''

''سردار جی میں فولادی جگر رکھتا ہوں۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا۔ میں بس فوج میں بھرتی ہونا چاہتا ہوں۔ گاوں والے مجھے یہ طعنہ مارتے رہتے ہیں کہ میں کام چور اور نکما ہوں۔ میں اُن کو دکھا دینا چاہتا ہوں کہ نہ ہی میں کام چور ہوں اور نہ ہی نکما ہوں۔''

اُس فوجی کو فتح محمد کی باتیں بڑی دلچسپ لگیں اور ساتھ ہی اُسنے محسوس کیا کہ اس لونڈے میں ولولہ ہے جوش ہے جو ایک جوان میں ہونا بہت ضروری ہے۔ اُسنے اُس سے وعدہ کیا کہ وہ ایک ہفتے کے بعد اُسے لینے آئے گا اور اُسے اپنے ساتھ لے جا کر اُسکی بھرتی کرائے گا۔ فتح محمد فوجی کی باتوں سے بڑا خوش ہوا۔ اُسے لگا کہ اُسکی برسوں کی مراد پوری ہوگئی۔

سردار نے اپنا وعدہ وفا کیا۔ وہ اُسے لینے فوجی جیپ میں بیٹھ کر آ گیا اور اُسے جیپ میں بٹھا کر اپنے ساتھ اُس جگہ لے گیا جہاں پر جوانوں کی بھرتی ہو رہی تھی۔ فتح محمد بھی بھرتی ہونے کے لئے

قطار میں کھڑا ہو گیا۔ اُسے کپڑے اُتارنے کے لئے کہا گیا۔ اُسکی چھاتی ناپی گئی۔ اُسے دوسرے لڑکوں کے ساتھ دوڑایا گیا۔ وہ دوڑنے میں اول نمبر آ گیا۔ قد کاٹھی سے وہ کافی مظبوط تھا۔ اوپر سے سردار فوجی اُس پر مہربان ہوا تھا۔ اُسے فوج میں بھرتی کر لیا گیا۔ جب وہ ٹریننگ پوری کر کے فوجی وردی میں اپنے گاوں پہونچا تو پورا گاوں اُسکے پیچھے ایسے چلنے لگا جیسے وہ دنیا کا آٹھواں عجوبہ ہو جسے دیکھنے کے لئے لوگ ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑ رہے تھے۔ جب اُسکے باپ نے اُسے فوجی وردی میں دیکھا تو پہلے اُسے یقین ہی نہیں آیا۔ جب وہ سلیوٹ مار کے اُس کے سامنے کھڑا ہو گیا تو باپ نے اُسے گلے سے لگایا اور اُسے جی بھر کے دعائیں دیں۔ اسکے اُلٹ اُسکی ماں اُسے فوجی وردی میں دیکھ کر سیاپا کرنے لگی۔ فتح نے اماں سے پوچھا۔

''اماں تو کاہے کو پیش از مرگ واویلا کر رہی ہو؟''

اماں اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بڑی معصومیت سے بولی۔

''کہتے ہیں جو فوج میں جاتا ہے وہ زندہ لوٹ کر نہیں آتا ہے''

''یہ خرافات تمہارے دماغ میں کس نے ڈالی۔ مرنا ہو تو آدمی گھر بیٹھے بیٹھے بھی مر سکتا ہے۔ وہ جو علی میر کا لونڈا پچھلے سال پیڑ سے گر کے مر گیا تھا وہ فوج میں تو نہیں تھا۔

وہ جو مختا موسی کا جوان بیٹا بس کے نیچے کچل کر مر گیا تھا وہ فوج میں تو نہیں تھا۔ اماں اتنی واہمی نہ بنو۔ مرنا جینا سب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جب مرنا لکھا ہو گا تو اسے کوئی نہیں ٹال سکتا۔ دیکھ اب مجھے محاذ پر جانا ہے۔ مجھے خوشی خوشی رخصت کرو۔ اگر تم نے مجھے اس طرح آنسوں کے ساتھ وداع کیا تو میں محاذ پر خاک لڑ پاوں گا۔ دشمن کو نشانہ بنانے سے پہلے خود ہی نشانہ بن جاوں گا۔'' ں کی جگہ کو نہیں اس بار فتح محمد کا باپ آگے آ کر بیوی کو سمجھاتے ہوئے بولا۔

''بیٹا محاذ پر جا رہا ہے۔ تمہارا سینہ تو فخر سے پھول جانا چاہے کہ جسے سب لوگ نکما سمجھتے تھے وہ فوجی بن گیا ہے اور دشمن سے لوہا لینے کے لئے محاذ پر جا رہا ہے۔ اسے خوشی خوشی رخصت کر دو''

اماں نے ایکبار پھر اپنے ڈوپٹے کے پلو سے اپنی آنکھیں پونچھ لیں اور پھر بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیر کر وہ اُسکی صحت و سلامتی کی دعائیں مانگتی رہی۔ فتح اماں سے گلے لگ کر رخصت ہوا۔ پلٹ کے

ایک بار بھی نہیں دیکھا۔ اماں سے جدا ہونے کا غم اُسے بھی اندر سے کاٹے جا رہا تھا۔ اُسکے جانے کے بعد اُسکی اماں چپکے چپکے آنسو بہاتی رہی۔ باپ بھی بت بنا بیٹھا رہا۔ ایک ہی تو بیٹا تھا۔ اُس کی جدائی کا غم دل کو برمائے جا رہا تھا۔

چھ مہینے بعد جب اُسکا پہلا منی آڈر آ گیا تو یہ خبر گاوں میں جنگل کے آگ کی طرح پھیل گئی۔ منی آڈر نہ ہوا جیسے فتح کے باپ کے یہاں کوئی خزانہ نکل گیا ہو۔ لوگ آ کر پوچھتے۔

''سنا ہے فتح نے محاذ سے منی آڈر بھیج دیا ہے؟''

ولی محمد کے تن بدن میں آگ لگ جاتی تھی۔ آخر انہیں اس بات سے کیا لینا دینا کہ میرے گھر میں کتنے پیسے کا منی آڈر آ گیا ہو۔ وہ جل بھن تو جاتا تھا تاہم اپنی لاچاری کا خیال کر کے وہ پتا مار کے بیٹھ جاتا تھا اور پوچھنے والے کے سامنے اوپری دل سے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہتا۔

''ہاں پہلا منی آڈر بھیجا ہے۔ پورے سولہ ہزار کا۔''

اتنی بڑی رقم سن کر لوگ حیرت اور جلن سے فتح کے باپ کی طرف دیکھتے جیسے اُسکے ہاتھ قارون کا خزانہ لگ گیا ہو۔ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگتے تھے کہ اگر اسی طرح اُسکے گھر میں ہن برستا رہا تو وہ ایک دو سال کے اندر وہ اس گاوں کا سب سے متمول آدمی بن جائے گا۔ فتح کا باپ ولی محمد نے یہ سارے پیسے ایک پرانے لوہے کے زنگ آلودہ ٹرنک میں چھپا کے رکھے تھے۔ دن میں وہ کئی مرتبہ ان نوٹوں کو گنتا رہتا اور پھر انہیں اپنے سینے سے لگاتا تھا۔ جس بیٹے کو وہ نکھٹو ناکارہ سمجھ کر ہر دن ٹوکتا رہتا تھا، آج وہی بیٹا اُسکا دلدر دور کرنے نکلا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے ولی محمد کے دن بدل گئے۔ اُسنے سب سے پہلے اپنے گھر کو ٹھیک کیا۔ فتح کا کمرہ بڑے ڈھنگ سے سجایا۔ گھاس پھوس کی چھت کی جگہ اُسنے ٹین کی چھت ڈلوادی۔ کمروں میں رنگ و روغن کروادیا۔ کھڑکیاں دروازے بدل دئے۔ شہر جا کر ایک ریڈیو خرید کر لایا۔ فتح کی اماں یہ سب چیزیں دیکھ دیکھ کے پھولے نہیں سما رہی تھی۔ یہ سب چیزیں اُسکے پوت کی کمائی سے آئی تھیں۔ اُنکی خوشحالی دیکھ کر اب فتح کے لئے رشتے بھی آنے لگے تھے۔ اچھے اچھے گھروں سے رشتے آنے لگے تھے۔

ولی محمد فتح سے پوچھے بنا کسی بھی رشتے پر مہر لگانا نہیں چاہتا تھا۔ کہیں کل لڑکے نے انکار کر دیا تو اُسکی گاوں میں تھڑی تھڑی ہو کے رہ جائے گی۔ ایک دن خبر آئی کہ فتح چھٹی پر گھر آرہا ہے۔ جونہی یہ خبر گاوں میں پھیلی، فتح کے گھر کے باہر لوگوں کی بھیڑ جمع ہوگئی۔ ہر کوئی فتح کے دیدار کرنا چاہتا تھا۔ ولی محمد کے پاوں مارے خوشی کے زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ فوج میں جا کر اُسکے بیٹے کی عزت کتنی بڑھ گئی تھی یہ دیکھ کر وہ پھول کے کپا ہوا جا رہا تھا۔

شام کا وقت تھا۔ بازار میں ایک ٹیکسی آ کے رکی۔ جونہی اُسمیں سے فتح اُترا تو لوگ گرتے پڑتے اُسکی طرف دوڑے اور اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ پھر اُسے کاندھے پر اُٹھا کر اُسے گھر تک لے آئے۔ اماں جسکی آنکھیں اُسکا انتظار کرتے کرتے پتھرا گئیں تھیں اُسے دیکھ کر دوڑ کے باہر آ گئی اور پھر اُسے بانہوں میں بھر کر اُسے سینے سے لگا کر مارے خوشی کے رو پڑی۔ فتح محمد اُسکا ہاتھ پکڑ کر اُسے اندر لے گیا۔ کمروں کی صورت دیکھ کر وہ دنگ رہ گیا۔ اماں کو ایک تپائی پر بٹھا کر وہ باپ کی طرف دیکھ کر بولا۔

''ابا تم نے تو گھر کا رنگ وروپ ہی بدل دیا ہے؟''

''میں نے سوچا بیٹا کہ اب تم کماو ہو گئے ہو۔ آئے دن لڑکی والے رشتہ لے کر آرہے ہیں۔ سب سے پہلے وہ گھر کو دیکھتے ہیں۔ جب گھر ہی ڈھنگ کا نہ ہو تو وہ آگے کیا بات کریں گے۔ میں نے سوچا سب سے پہلے گھر کو سدھارنا چاہیے تاکہ جو بھی آئے وہ گھر دیکھ کے خوش ہو جائے۔ اچھا کیا نا میں نے؟''

''مجھ سے کیا پوچھ رہے ہو۔ تم مالک ہو جو تمہارا دل کرے کر لینا۔ یہ مت سوچنا کہ یہ میری کمائی کے پیسے ہیں، کہیں میں کچھ بول نہ دوں۔ یہ سب تمہارے پیسے ہیں۔ تم جیسے چاہو ان پیسوں کا استمال کر سکتے ہو''

وہ اماں کی طرف مڑا اور پھر اُسکے ہاتھوں کو اپنے چہرے پر پھیر کر بولا۔

''تمہارے سامنے جیتا جاگتا کھڑا ہوں۔ اچھی طرح دیکھ، تمہارا پوت کمزور تو نہیں ہوا ہے؟''

اماں اُسکی بلائیاں لے کر بولی۔

''اللہ تمھیں خوش رکھے۔ مہینوں سے بس تمہاری ہی راہ تکا کرتی تھی کہ تم کب آو گے۔ کیا کروں ماں ہوں۔''

''اب تو میں دو تین مہینے میں چھٹی لے کے آجایا کروں گا۔''

اتنے میں ولی محمد اندر آ کر بولا۔

''باہر سارا گاوں تم سے باتیں کرنے کے لئے جمع ہوا ہے۔ اماں سے ساری رات باتیں کر لینا۔ پہلے اس مصیبت سے تو ہمیں چھٹکارا دلا دو''

فتح محمد باہر آ گیا۔ باہر آتے ہی سب لوگ کھڑے ہو گئے۔ وہ بیچ میں جا کر بیٹھ گیا۔ لوگ باری باری سوال کرنے لگے۔

''بھیا یہ تو بتاو کہ تم کس محاز پر تھے۔؟''

''میں اوڑی کے بوڈر پر ڈیوٹی دے رہا تھا۔''

''گولی وولی بھی چلائی کہ نہیں؟''

''سرحد پر ہر دم دنا دن چلتی رہتی ہے۔ وہ شروع کرتے ہیں تو ختم ہم کرتے ہیں۔ کبھی ہم شروع کرتے ہیں تو ختم وہ کرتے ہیں''

''تمہیں ڈر تو نہیں لگتا ہے؟''

''کس بات کا ڈر؟ ہم جب وردی پہن لیتے ہیں تو ڈر ور سب ہوا ہو جاتا ہے۔ ہر جوان میں فولادی طاقت آجاتی ہے۔ ہم موت کو بھول جاتے ہیں اور جو بھی ہم سے ٹکرانے کی کوشش کرتا ہے ہم اُسے گولیوں سے بھون ڈالتے ہیں۔''

وہ بہت دیر تک اُن سے باتیں کرتا رہا۔ اُنہیں کئی قصے سناتا رہا۔ جب رات کے بارہ بجے تو اُس نے سب کو ہنسی خوشی سب کو گھر سے رخصت کر دیا۔ اماں اندر بیٹھے بیٹھے سوکھ گئی تھی۔ فتح محمد کافی تھکا ہوا تھا۔ اُس نے دو نوالے اُگل نگل کر کھا لئے اور پھر جا کر سو گیا۔ اُسکی ماں اُسکے سرہانے بیٹھی بہت دیر

تک اُسے نہارتی رہی اور اُس کی بلائیاں لیتی رہی۔

ایک ہفتہ کیسے گزر گیا اُسے پتا ہی نہیں چلا۔ جب وہ وردی پہن کے تیار ہو کے ماں باپ کے سامنے کھڑا ہو گیا تو ولی محمد نے اُسے سینے سے لگا کر رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''ایسا لگ رہا ہے جیسے تم ابھی آئے اور ابھی چل دئے۔ تمہیں جی بھر کے دیکھ بھی نہیں پائے ہم۔ اگلی بار آوگے تو لمبی چھٹی لے کے آجانا۔ میں تب تک تمہارے لئے کوئی اچھی سی لڑکی بھی دیکھ کے رکھوں گا تا کہ تمہارے آتے ہی نکاح ہو جائیں اور تمہیں کچھ ہفتے اپنی منکوحہ کے ساتھ رہنے کو مل جائیں ۔''

''اگلی بار میں ایک مہینے کی چھٹی لے کر آوں گا۔ پھر تم لوگ اپنے سبھی ارمان پورے کر لینا''

کہہ کر وہ ماں سے لپٹ گیا۔ وہ پہلے سے ہی بھری ہوئی بیٹھی تھی۔ بیٹے کو کلیجے سے لگاتے ہی آنسوں کے سوتے اُبل پڑے اور وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ فتح محمد نے اُسکی ڈھارس بندھائی اور پھر بہت جلد آنے کا وعدہ کر کے وہ چلا گیا۔ اُسکی ماں بہت دیر تک سبکتی رہی جب کہ ولی محمد غم کی مورت بنے دروازے پر بہت دیر تک بیٹھا رہا۔

فتح محمد کے ماں باپ اُسکے لوٹنے کا انتظار کرتے رہے۔ اُنہیں کیا خبر تھی کہ ایک دن اُن کا بیٹا تابوت میں بیٹھ کر گھر آئے گا۔ وہ لڑتے لڑتے شہید ہو چکا تھا۔ جب فوجی گاڑی میں اُسکا تابوت گاوں پہنچا تو گاوں میں کہرام مچ گیا۔ نہ صرف اُسکے گاوں کے لوگ بلکہ قرب و جوار کے باسی بھی اُسکے جنازے میں شامل ہونے کے لئے چلے آئے۔ فتح محمد نے جیتے جی جو چاہا تھا وہ اُسے مر کر ملا تھا۔ اُسے فوجی اعزاز کے ساتھ دفنا دیا گیا۔ ہزاروں سوگواروں نے اُسے نم آنکھوں سے وداع کیا۔ فتح محمد نے شہادت کا درجہ پا کر وہ سب کچھ پا لیا تھا جو بہت کم انسان جیتے جی پا لیتے ہیں۔



ماں روتی ہے

اروں دتی پچھلے آٹھ سال سے بیوگی کا دکھ جھیل رہی تھی۔ اُسکا شوہر پنڈت گوپی ناتھ اُسے اپنے اکلوتے بیٹے کے سہارے چھوڑ کے اس جہاں فانی سے کوچ کر گیا تھا۔ اُسے اس بات کا گمان بھی نہیں تھا کہ ایک دن وہ اپنے ہی گھر میں اجنبی بن کے رہ جائے گی۔ اُسکی بہو جسے وہ بڑے چاو سے اس گھر میں لے آئی تھی، اُسکا جینا اجیرن کر دے گی۔ شادی سے قبل جب اُسنے بہو کو دیکھا تھا تو ایسا لگا تھا جیسے وہ رام جی کی گائے ہو۔ وہ ایسی شریف زادی بن کے اُن کے سامنے پیش ہوئی تھی جیسے وہ اخلاق اور شرافت کی مورت ہو۔ بولتی اتنا کم تھی کہ جیسے اُسکے منہ میں زبان ہی نہ ہو۔

یہ طلسم جلدی ہی ٹوٹا۔ ایک بار اُس نے گھر میں قدم کیا رکھا، شرافت کے سارے نقاب اُسنے اُٹھا کے پھینک دئے۔ زبان جو پہلے چلتی نہیں تھی اب قینچی کی طرح چلنے لگی تھی اور وہ اپنی اسی زبان سے اروں دتی کو دن میں بیسوں مرتبہ چھلنی چھلنی کر کے رکھ دیتی تھی۔ اروں دتی اپنے بیٹے کی طرف فریاد بھری نگاہوں سے دیکھتی تو وہ اُسکو تسلی دینے کی بجائے اُسکے دل پر مزید چرکے لگاتا تھا، اپنی کڑوی کسیلی باتوں سے اُسکے دل و جگر کو مجروح کر کے رکھ دیتا تھا۔ شادی کے بعد اُس پر بیوی کا رنگ چڑھ گیا تھا۔ وہ کمبخت ایک نمبر کا زن مرید بن کے رہ گیا تھا۔ جو بیوی بولتی تھی وہ اُسی کو سچ مانتا تھا۔ باقی جو بھی بولتے تھے وہ اُسکی نظر میں جھوٹ ہوتا تھا۔ اروں دتی اندر ہی اندر کڑھتی رہتی تھی مگر زبان سے کچھ بول نہیں پاتی تھی۔ اُسے ڈر تھا کہ کہیں اُسکی بہو اُسے گھر سے باہر نہ نکال دے۔ بہو کو اُس سے اس بات پر چڑ تھی کہ وہ

اُسے بات بات پرٹوکا کرتی تھی۔ جس گھر کو اُس نے تنکا تنکا جوڑ کر بنایا تھا اُس گھر کی بے حرمتی ہوتے دیکھ کر وہ کیسے آنکھیں بند کر کے بیٹھ سکتی تھی؟ اُسکی بہو نیلا میں تحمل کا یارا نہ تھا۔ وہ چار بھائیوں کی لاڈلی تھی اسلئے وہ بڑے ناز سے پلی تھی۔ کسی نے میکے میں آج تک اُسے روکا ٹوکا نہیں تھا اسلئے جب وہ بیاہ کے سسرال آگئی تو اُسکے رنگ ڈھنگ میں کوئی بدلاو نہیں آیا۔ وہ نل کھلا چھوڑتی تھی۔ ارون دتی ٹوکتی تو وہ ہنگامہ کھڑا کر دیتی تھی۔ چولھے پر دودھ چڑھا کے وہ ریموٹ لے کے ٹی وی کے سامنے بیٹھ جاتی تھی۔ جب دودھ میں اُبال آجاتا اور کچھ دودھ گیس چولھے پر گر کر جلنے لگتا تھا تو ارون دتی چلاتی تھی۔ نیلا کے تن بدن میں آگ لگ جاتی تھی اور وہ چولھے پر اپنا سارا غصہ اُتار دیتی تھی۔ دروازہ اتنے زور سے مارتی تھی کہ ارون دتی کو لگتا تھا جیسے اُسنے اُسکے سینے پر گھونسہ مارا ہو۔ بظاہر یہ چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں مگر ان باتوں نے فساد کی صورت اختیار کی تھی۔ ارون دتی نیلا کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکتی تھی۔ رات کو جب اُسکا پتی آشو گھر لوٹتا تھا تو نیلا اپنی شکایتوں کا پنڈار کھول کے بیٹھتی تھی۔ وہ بیوی سے کچھ کہہ نہیں پاتا تھا بس نزلہ بیچاری ارون دتی پر گرتا تھا۔

ارون دتی روز روز کی اس چخ چخ سے اتنی عاجز آچکی تھی کہ وہ یہ بوجھ اپنے دل پر لے بیٹھی۔ دھیرے دھیرے اُسکی صحت گرتی چلی گئی۔ بیٹے نے دو ایک بار ڈاکٹر کو گھر پر بلایا۔ ڈاکٹر نے دوائیاں تو دے دیں مگر کوئی افاقہ نہ ہوا۔ ارون دتی اندر ہی اندر سے گھلتی چلی گئی۔ بالآخر اُسنے کھاٹ پکڑ لیا۔ اسی بیچ وادی کے حالات بگڑ گئے۔ وہ کلگام کے جس گاوں میں رہتے تھے وہاں عسکریت پسند سرگرمیاں کچھ زیادہ ہی بڑھنے لگی تھیں۔ پنڈت یہاں آٹے میں نمک کے برابر تھے۔ کچھ لوگ ڈر کے مارے نقل مکانی کرنے لگے۔ نیلا بھی حالات سے دکھی اور پریشان تھی۔ وہ بھی اپنے شوہر کو لے کے یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ آشو اسکے لئے تیار نہ تھا۔ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ ایک رات آشو کے گھر میں کسی نے ایک چٹھی پھینک کر اُسے وادی سے چلے جانے کے لئے کہا۔ یہ کسی کی شرارت تھی یا اسکے پیچھے کوئی تنظیم تھی یہ سوچنے سمجھنے کا آشو کے پاس وقت کہاں تھا۔ چھٹی پڑھ کر آشو کے ہوش اُڑ گئے۔ گھر میں کہرام مچ گیا۔ نیلا تو ڈر کے مارے رات کو سو نہیں پائی۔ وہ آشو سے اس بات پہ خفا تھی کہ اُسنے اُسکی بات نہ سنی۔ آشو

نے بھاری من سے اپنے ایک دوست کو فون کر کے گاڑی بھیجنے کے لئے کہا۔ جونہی گاڑی آئی اُنہوں نے رات کے اندھیارے میں سامان گاڑی میں ڈال دیا اور جب نیلا گاڑی میں بیٹھ گئی تو آشو نے نیلا سے کہا۔

''تم اگر آگے بیٹھو گی تو اماں جی کہاں بیٹھے گی؟''

نیلا تنک کر بولی۔ ''ہمارا تو ابھی خود کا کوئی ٹھور ٹھکانہ نہیں اُسے کہاں اُٹھاتے پھریں گے؟ اُسے فی الحال یہیں رہنے دو۔ جب مکان کا بندوبست ہو جائے گا پھر اُسے لے کے آجانا۔''

آشو جھلا کر بولا۔ ''ارے ایسے کیسے میں ماں کو چھوڑ کے چلا جاوں۔ لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے۔ مجھ سے کہیں زیادہ تھوتھو تمہاری ہوگی''

اب کے نیلا بدک کر بولی۔ ''اگر اس زندہ لاش کو تم میری چھاتی پر بٹھا کے رکھنا چاہتے ہو تو تم اپنی ماں کو لے کر جاو۔ میں کہیں اور چلی جاوں گی''

آشو ڈھیلا پڑ گیا۔ اُسنے بھاری من سے ماں کے کمرے میں قدم رکھا اور ندامت سے سر جھکاتے ہوئے بولا۔

''میں نیلا کو جموں لے کے جا رہا ہوں۔ پاپا جی کا فون آیا تھا۔ بلو کی طبعیت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ میں اپنے بچوں کو اب ننہیال میں نہیں رکھوں گا۔ اُنہیں واپس اپنے گھر لے آوں گا۔''

اورن دتی پوتے کی بیماری کی خبر سن کر ہل گئی۔ وہ بمشکل تمام اُٹھ کر بیٹھ گئی اور واویلا کرنے لگی۔

''اسقدر پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ شاید ماں کو یاد کر رہا ہوگا اس لئے بیماری کا بہانہ بنا لیا۔ ہم لوگ پرسوں تک بچوں کے ساتھ لوٹ آئیں گے۔ تم جیسے تیسے یہ دو دن اکیلے کاٹ لینا۔ میں گھر کے باہر تالا ڈال کے جا رہا ہوں تا کہ کوئی گھر میں داخل نہ ہو جائے۔ تم کوئی چنتا مت کرنا۔ میں جلدی لوٹ کے آوں گا''

''جا مہا گنیش تمہاری رکھشا کرے۔ جلدی لوٹ کے آجانا'' اورن دتی نے بھاری من سے کہا۔ آشو ماں سے آنکھیں ملائے بنا تیزی سے باہر چلا گیا اور باہر تالا ڈال کر وہ گاڑی میں جا کر بیٹھ

گیا۔ گاڑی زناٹے کے ساتھ رات کے اندھیارے کو چیرتے ہوئے نکل گئی۔ آشو کی آنکھوں سے آنسو بہے چلے جارہے تھے۔ اُسنے آج گھر ہی نہیں کھویا تھا بلکہ اپنی ماں کو بھی کھودیا تھا۔

اروندتی اپنی کھاٹ پر پڑی تھی۔ اُسے رہ رہ کے اپنے پوتے کی یاد آرہی تھی۔ وہ کب سے اُسے دیکھنے کیلیئے ترس رہی تھی۔ اُسکے انتظار میں اُسکی آنکھیں پتھرا گئیں تھیں۔ یہ پتھر دل نیلا تھی جس نے اُنہیں اپنی دادی سے دور کردیا تھا۔ وہ بیچاری اس بات سے بے خبر تھی کہ اُسکے بیٹے نے اُس سے جھوٹ بولا تھا۔ وہ اُسے بے یارومددگار چھوڑ کے چلے گئے تھے۔ وہ تو اب بھی اسی خوش فہمی میں تھی کہ ایک دو دن کے اندر اُسکا بیٹا اُسکے پوتے کو لے کر آئے گا اور وہ اُسے اپنے سینے سے لگا ئیگی۔ اُسے جی بھر کے پیار اور دلار کرے گی۔ وہ بیچاری یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اب کبھی لوٹنے والے نہیں ہیں۔ وہ اُسے اکیلے مرنے کے لئے چھوڑ گئے ہیں۔

ایک دن گزر گیا۔ وہ بستر پر ہی پڑی رہی۔ رات کو اُسے بہت بھوک لگی۔ وہ بمشکل تمام اُٹھی اور دیوار کا سہارا لے کر کچن تک چلی گئی۔ کچن میں جو کچھ اُسے ملا اُس نے پیٹ کی آگ بجھالی۔ رات کو وہ بڑی بے قراری محسوس کرنے لگی۔ نیند آنکھوں سے غائب تھی۔ وہ لشتم پشتم ایک بار پھر بستر سے اُٹھی اور آشو کے کمرے تک چلی گئی۔ کمرے کی ہیت دیکھ کے وہ دھک سے رہ گئی۔ کمرے کی ہیت کہ رہی تھی جیسے کوئی اس گھر کو لوٹ کے چلا گیا ہو۔ ہر چیز بکھری پڑی تھی۔ الماریاں کھلی پڑی تھیں۔ ان میں رکھے کپڑے لتے ندارد تھے۔ نیلا کا سارا سامان غائب تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی کہ اگر وہ ایک دو دن کے لئے جموں چلے گئے تھے تو یہ سارا سامان اپنے ساتھ لینے کی ضرورت کیا تھی۔ اُسکے من میں طرح طرح کے شبہات سر اُٹھانے لگے معاً اُسنے ان سارے شک وشبہات کو اپنے من سے جھٹک دیا۔ وہ آشو کی نیت پر کبھی شبہ کر ہی نہیں سکتی تھی۔

کئی دن گزر گئے۔ اُسمیں اتنی سکت نہ تھی کہ وہ بار بار اُٹھ کر کچن میں جائے اور اپنے لئے کھانا بنائے اسلیئے کئی روز وشب اُسنے بے خوار وخواب ہی گزار دئے۔ بس ہر گزرے دن کے ساتھ اُسکا دل بیٹھا جارہا تھا اور من میں رنج وغم، یاس اور نا اُمیدی اپنا پرتو پھیلاتی جارہی تھیں۔ اُسکے پاس اپنا دکھ درد

ظاہر کرنے کے لئے رونے کے سوا کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ وہ رو رو کے بس اپنے من کو ہلکا کرتی۔ اسکے سوا وہ اور کر ہی کیا سکتی تھی۔

دو دن کے بعد جب بھوک کے مارے اُسے چکر آنے لگے تو اُسنے جیسے تیسے کچن میں جا کر جو کچھ بھی ہاتھ لگا اُس سے اپنی بھوک مٹالی۔ دن تو جیسے تیسے کٹ جاتا تھا لیکن رات بے چینی اور خوف و دہشت میں کٹ جاتی تھی کیونکہ اس علاقے میں حفاظتی دستوں کی ہلچل کافی بڑھ گئی تھی۔ وہ عسکریت پسندوں کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ جنگجو حفاظتی دستوں کو غچہ دینے کے لئے اپنی پناہ گاہوں میں جا کر چھپ جاتے تھے۔ ایک رات جب وہ پیاس کے مارے مری جارہی تھی۔ اُس میں اتنی سکت نہ تھی کہ وہ کچن تک جا کے اپنی پیاس بجھا سکے۔ وہ تپتی ریت پر پڑی مچھلی کی طرح اپنے بستر پر تڑپ رہی تھی تبھی اُسے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اُسکے کان کھڑے ہو گئے۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا، وہ بس اپنی سانس روکے اپنے بستر پر پڑی رہی۔ باہر دو بندوق بردار کھڑکی کے راستے گھر میں داخل ہوئے تھے۔ یہ دو جنگجو پولیس کو مطلوب تھے اور انکی دھڑ پکڑ کے لئے کئی جگہ ناکے لگائے گئے تھے۔ یہ دونوں نوجوان مقامی تھے۔ انہیں کہیں سے معلوم پڑا تھا کہ یہ کشمیری پنڈت کا گھر ہے جو نقل مکانی کر چکے ہیں۔ اُنہیں یہ مکان چھپنے کے لئے محفوظ لگا اسلئے وہ اس گھر میں رات کے اندھیارے میں پچھواڑے کے راستے داخل ہوئے۔ جب وہ گھر کا معائنہ کر رہے تھے تبھی اُنہیں کسی کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ اُنہوں نے ہڑ بڑاہٹ میں اپنی بندوقیں تان لیں اور اُس کمرے کی طرف بڑھنے لگے جہاں سے کراہنے کی آواز آرہی تھی۔ اُنہوں نے جب ماچس کی تیلی جلا کر ارون دتی کو کمرے میں پایا تو اُنکی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ایک جنگجو نے اُس پر نشانہ سادھا جب کہ دوسرے نے اُسے روکا۔ ''گولی مت چلاو۔ یہ کوئی بوڑھی عورت ہے''

''کوئی بھی ہو، یہ ہمارے لئے مصیبت بن سکتی ہے'' دوسرا غصے سے بولا۔

''تم گولی چلاوگے تو حفاظتی دستوں کو ہمارا ٹھکانہ آسانی سے مل جائے گا۔ ایسی حماقت مت کرنا۔''

دوسرے نے اُسکی بات سے صاد کرتے ہوئے اپنی بندوق نیچے کی۔ پہلا جنگجو اُسکے

قریب چلا گیا۔ ارون دتی کی مارے خوف کے زبان گنگ ہوگئی تھی۔ وہ اتنی ڈری ہوئی تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ جب اُس جنگجو نے دیا جلا کے اُسکا چہرہ دیکھا تو اس ملگجی رات میں اُسکا چہرہ ایسے اُبھر کے آیا کہ وہ بس اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اُسے اپنی ماں یاد آ گئی۔ ایسا ہی نورانی چہرہ۔ ایسی ہی معصومیت۔ ایسی ہی ممتا بھری آنکھیں۔ اُسنے سوچا یہ مائیں ایک جیسی کیوں ہوتی ہیں؟ وہ جب بیمار ہوئی تھی تو اسی طرح اُسکے چہرے پر ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوتے تھے۔ اُسنے ارون دتی کے ہاتھ کو سہلاتے ہوئے کہا۔

''ڈرو مت مائی۔ ہم تمہیں مارنے نہیں آئے ہیں۔ ہم پولیس سے بچنے کے لئے تمہارے گھر میں چھپنے آئے ہیں۔ مجھے حیرت ہو رہی ہے کہ باہر تالا لگا ہوا ہے اور اندر تم اس گھر میں اکیلی ہو۔ تم اس گھر میں اکیلی رہتی ہو کیا؟''

اب کے اُسکی ویران آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ وہ روتے ہوئے بولی۔

''میرا ایک چھوٹا سا پریوار ہے۔ میرا بیٹا بہو اور دو پوتے ہیں۔ پوتے ننہال میں رہتے ہیں جب کہ بہو اور بیٹا میرے ساتھ رہتے ہیں۔ اُنہیں اچانک جموں جانا پڑا کیونکہ میرا پوتا بیمار ہے۔ وہ اُسے لینے گئے ہیں۔ میرا بیٹا یہ کہہ کے گیا تھا کہ وہ ایک دو دن میں لوٹ آئیں گے پتا نہیں وہ اب تک کیوں نہیں لوٹے''

''وہ جب جموں چلے گئے تو تمہیں ساتھ لے کے کیوں نہیں گئے وہ؟''

''میں کب سے بستر پر پڑی ہوں۔ مجھے کیسے لے کے جا سکتے تھے وہ۔ ویسے بھی وہ صدا کے لئے تھوڑے ہی گئے ہیں۔ ایک آدھ ہفتے میں لوٹ کے آئیں گے''

''اُنہوں نے تم سے جھوٹ بولا۔ وہ بچے کو لینے نہیں گئے بلکہ یہاں سے بھاگ گئے ہیں اور تمہیں یہاں چھوڑ گئے مرنے کے لئے۔ اگر اُنہیں تمہارا اتنا خیال ہوتا تو باہر سے تالا لگا کے نہیں جاتے۔''

''نہیں نہیں میرا بیٹا اتنا کٹھور نہیں ہوسکتا۔ وہ میرے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرسکتا''

''او مائی کس دنیا میں رہ رہی ہو۔ وہ زمانہ اور تھا جب بچے ماں باپ کی پرواہ کرتے تھے۔ وقت بدل چکا ہے۔ تمہارا بیٹا تم سے چھٹکارا پانے کے لئے تمہیں یہاں بے یار ومددگار چھوڑ کے چلا گیا۔ میری بات کا یقین نہیں تو جا کر اپنے پڑوسیوں سے پوچھو جنہوں نے اُسے رات کو سامان نکالتے دیکھا۔ اگر وہ دو دن کے لئے جا رہے تھے تو سامان لینے کی ضرورت کیا تھی؟''

یہ بات تو سچ تھی۔ وہ سامان لے کے کیوں گئے۔ اب کے ارون دتی رو پڑی۔ اُسکے خواب وخیال میں نہیں تھا کہ ایسا وقت بھی آئے گا جب اُسکے بیٹے کا خون سفید ہو جائے گا اور وہ اُسے اسطرح مرنے کے لئے چھوڑ کے جائے گا۔ وہ بلک بلک کے رونے لگی۔ روتے روتے اُسکی ہچکیاں بندھنے لگیں۔ پہلے والے جنگجو نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''مائی رومت۔ رونے سے مشکلیں آسان نہیں ہو جاتیں۔ یہ تو تیرے بیٹے کا نصیب اچھا ہے کہ وہ یہاں نہیں ہے۔ بخدا اگر وہ یہاں ہوتا تو ہم اُسے کھڑے کھڑے موت کے گھاٹ اُتار دیتے۔ ایسے کم بخت کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔''

''نہیں بیٹا اُسے کچھ مت کہنا۔ وہ بہت ہی بھولا ہے۔ وہ آج بھی مجھ سے بے انتہا پیار کرتا ہے۔ یہ سارا کیا دھرا میری بہو کا ہے۔ وہ میرے بیٹے کو مجھ سے چھیننا چاہتی ہے'' وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

باہر گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ رات سیاہی کی ردا اوڑھ چکی تھی۔ ماحول میں ایک دم سناٹا چھایا ہوا تھا۔ بیچ بیچ میں رات کے اس سناٹے کو آوارہ کتوں کی بین مرتعش کر دیتی تھی۔ وہ دونوں جنگجو بڑے اضطراب اور بے چینی کی کیفیت سے دو چار تھے۔ وہ بار بار کھڑکی کے پاس جا کر باہر کا جائزہ لیتے تھے۔ اس اضطراری کیفیت میں وہ کبھی کمرے میں ٹہلتے یا پھر کمرے سے باہر چلے جاتے تھے۔ اچانک ارون دتی کی آواز سے اُنکے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ پانی مانگ رہی تھی۔ پہلے والے جنگجو نے اپنی رائفل نیچے رکھ دی اور وہ کچن کی طرف بھاگا۔ ماچس جلا کر وہ ایک گلاس پانی لانے میں کامیاب ہو گیا۔ اُسنے ارون دتی کے پیچھے ٹیک لگا کر اُسے بٹھا لیا اور پھر اُسے پانی پلانے لگا۔ ارون دتی کافی نقاہت محسوس کر رہی

تھی۔ اُس جنگجو کو اُس پر دیا آ گئی۔ اُسنے پوچھا۔

''تم اتنی کمزور ہو۔ اپنا کھانا تم کیسے بنا لیتی ہو؟''

''دو دن سے کچھ نہیں کھایا میں نے۔ میں دو دن سے بھوکی پڑی ہوں۔''

''ہمارے پاس کچھ پھل فروٹ ہیں۔ کھاوگی کیا؟''

ارون دتی یتیموں جیسی صورت بنا کر اُسکی طرف دیکھنے لگی۔ ایکبار پھر اُسکی آنکھیں چھلک پڑیں۔ اُس جنگجو نے باہر جا کر اپنی تھیلی میں سے کچھ پھل نکالے اور پھر اُسے کھلاتے ہوئے بولا۔

''جب کبھی میری ماں بیمار پڑتی تھی تو میں اُسے اسی طرح پھل کھلایا کرتا تھا۔ پتا نہیں ابھی وہ کس حال میں ہوگی۔'' یہ کہہ کر اُسنے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

''بیٹا میں نے تم سے یہ پوچھا نہیں کہ تم کون ہو اور اسطرح رات کو چھپ چھپ کے کیوں پھر رہے ہو؟''

''ہم جہاد کر رہے ہیں۔ ہم کشمیر کو آزاد کرنا چاہتے ہیں۔ اس پر ہندوستان کی فوجوں نے غاصبانہ قبضہ کیا ہے نا۔''

ارون دتی سیاست کے بارے میں کم جانکاری رکھتی تھی۔ وہ بس خاموشی سے اس جنگجو کی باتیں سنتی رہی۔ کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا۔ وہ تو اپنی ہی سوچ میں گم تھی قدرے توقف کے بعد اُس جنگجو نے ارون دتی سے استفسار کیا۔

''کیا سوچ رہی ہو مائی؟''

''اپنے بیٹے آشو کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔ نہ جانے وہ کہاں اور کس حال میں ہوگا۔''

''اُسنے تمہارے بارے میں نہیں سوچا۔ تم اُسکے بارے میں کیوں مری جا رہی ہو؟''

''کیا کروں۔ میں ایک ماں ہوں۔ ماں اس دھرتی کی طرح ہوتی ہے جو انسان کو سب کچھ دیتی ہے۔ بدلے میں کچھ نہیں مانگتی۔ اگر تمہاری ماں زندہ ہے تو وہ بھی اسی طرح تمہاری چنتا میں مری

جا رہی ہوگی۔تمہاری سلامتی کے لئے دعائیں مانگ رہی ہوگی۔کیا تم نے کبھی یہ سوچا کہ اُس ماں پر کیا گزر رہی ہوگی جس کا بچہ اُس سے دور چلا گیا ہو؟''

وہ جنگجو ایک دم جذباتی ہوگیا۔اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہہ پاتا باہر کچھ ہلچل ہونے لگی۔وہ دونوں بھاگ کر اُسکے پاس آئے اور اُسے بازو سے کھینچ کر باہر ایک تاریک کونے میں لے گئے۔باہر حفاظتی دستوں نے مکان کو گھیر لیا تھا۔پہلے والے جنگجو نے دوسرے سے کہا۔

''اگر ہم نے گولی چلادی تو یہ بوڑھیا بے موت مرجائے گی''

''تم اس بوڑھیا کے لئے مرے کیوں جارہے ہو۔ارے اس چھوڑ اپنی سوچ۔اس گھیرے کو کیسے توڑا جائے؟''

اُسنے کھڑکی کے پاس جاکر اپنی عقابی نظروں سے باہر کا جائزہ لیا۔سپاہیوں نے مکان کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔وہ بدحواس ہوکر ارون دتی کے کمرے کی طرف لپکے۔پہلا والا ارون دتی کے پاس گیا اور اُس سے سرگوشی کے انداز میں بولا۔

''مائی اب ہمارے جانے کا وقت آگیا ہے۔ابھی یہاں گولیاں چلیں گی۔تم چاہو تو اپنے آپ کو بچا سکتی ہو۔ہم تمہیں پچھلے دروازے سے باہر نکال دیں گے۔تم ہاتھ کھڑے کرکے فوجیوں کی طرف بڑھنا وہ تمہیں اس جگہ سے بحفاظت کسی محفوظ مقام پر لے جائیں گے''

ارون دتی کا منہ فق ہوگیا۔دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔اُسے موت کی آہٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔دفعتاً اُسکے اندر سے آواز آئی۔

''ارون دتی تم موت سے کیوں ڈر رہی ہو۔جس طرح کی زندگی تم جی رہی ہو وہ تو موت سے بھی بدتر ہے۔۔تمہیں تو خوش ہونا چاہے کہ جس موت کو تم گلے لگانے کے لئے کب سے منتظر تھی وہ موت تمہارے دروازے پر آکے کھڑی ہے۔ڈرمت اور اطمینان سے بیٹھی رہ۔ایک پل کی دیری ہے۔ایک گولی سے تیرا کام تمام ہوگا۔''

''مائی سوچ کیا رہی ہو۔سوچنے کا وقت نہیں ہے۔اس سے پہلے کہ وہ کاروائی کریں

ہمیں جوابی کاروائی کرنی ہوگی‘‘

’’مجھے اپنی زندگی کی پرواہ نہیں ۔ میں نے تو اپنے دن پورے کر لئے ہیں مگر تم دونوں نے تو ابھی دنیا پوری طرح دیکھی بھی نہیں ہے۔ میں تم لوگوں کو کیسے مرتے دیکھ سکتی ہوں۔ میں ماں ہوں۔ ماں کا کوئی مذہب، کوئی ذات نہیں ہوتی۔ نہیں نہیں میں تم لوگوں کو مرنے نہیں دوں گی؟‘‘

’’مائی ہماری فکرمت کرو۔ ہم تو مرنے کے لئے ہی نکلے ہیں ۔ ہم نہیں چاہتے کہ تم ہمارے ساتھ بلاوجہ ماری جاو۔ تمہارا تو کوئی قصور بھی نہیں ہے۔‘‘

اب کے ارون دتی کی آواز سخت ہوگئی۔ اُسنے جنگجو سے درشتی سے کہا۔

’’تم تو مرجاوگے پر یہ تو سوچو تمہاری ماوں کا کیا ہوگا۔ وہ اس درد کو کیسے جھیل پائیں گی۔ تم ایک بارمروگے مگر وہ لاکھ بارمرے گی۔ پل پل تل تل کر کے مرے گی وہ؟‘‘

’’او مائی تم ہماری چھوڑ۔ اپنی جان کی خیرمنا۔ جان پیاری ہے تو یہاں سے چلی جا۔‘‘ دوسرا جنگجو جھلا کے بولا۔

وہ عجب گومگو کی حالت میں تھی۔ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی فیصلہ لے پاتی حفاظتی دستوں نے ان جنگجوں کو للکارنے کے لئے فائر کردیا۔ ایک جنگجو نے جوابی فائر کر دیا۔ اسکے بعد گولیوں کی بارش شروع ہوگئی۔ ایک گولی پہلے والے جنگجو کو لگی ۔ وہ ارون دتی کے پہلو میں جاکے گرا۔ ارون دتی بدحواسی کے عالم میں کبھی اُسکے بغل میں پڑے جنگجو کو دیکھ رہی تھی جو تڑپ رہا تھا۔ اُسکی ممتا جاگی۔ اُسنے اُس کا سراوپر اُٹھا کر اسے اپنی گود میں رکھ لیا اور اسکا سر سہلانے لگی۔ اُس جنگجو نے تحسین بھری نظروں سے ارون دتی کی طرف دیکھا اور پھر اُسکی آنکھوں سے اشکوں کے سوتے اُبل پڑے۔ گولہ باری جاری تھی۔ مکان اس ناگہانی یلغار سے پوری طرح تحس نحس ہوگیا تھا۔ ہر طرف کانچ اور کنکر بکھرے پڑے تھے۔ دیواریں کسی چیچک زدہ انسان کی طرح دکھائی دے رہی تھیں۔ ایک گھنٹے کے بعد یہ گولہ باری تھمی۔ پولیس نے مشینوں کی مدد سے ملبہ ہٹایا اور لاشوں کی تلاش میں وہ اندر داخل ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ اندر کا نظارہ دیکھ کر وہ حیران وششدر رہ گئے۔ ارون دتی اپنی گود میں اُس جنگجو کی لاش لئے خود بھی موت کے سفر پر نکل چکی تھی۔



مکی کے آنسو

بلی رام کشتواڑ کے ایک پسماندہ گاوں کا رہنے والا تھا۔ وہ دس سال قبل بہ سلسلہ روزگار جموں آیا تھا اور پھر وہ یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ اُسنے یہاں آ کے بیس ہنڈیوں کا مزہ چکھا۔ کچھ دن ایک ریستوراں میں بیرے کی نوکری کر لی۔ وہ نوکری راس نہیں آئی تو ایک شراب کی دکان میں کام کیا۔ وہاں بھی بہت جلد دل بھر گیا۔ ایک دو مہینے بس کنڈکٹری کی۔ ایک دن ڈرائیور سے جھگڑا ہوا۔ وہ اُسکی وردی اُسکے متھے مار کر چلا گیا۔ اصل میں اُسنے سیمیابی طبعیت پائی تھی۔ وہ زیادہ دن تک ایک جگہ ٹکتا نہیں تھا۔ تھک ہار کے اُسنے ایک آئس کریم فیکٹری میں نوکری کر لی۔ وہاں اُسنے ایک سال کام کیا۔ اس ایک سال میں اُسنے آئس کریم بنانا سیکھ لیا۔ بس پھر کیا تھا اُسنے جموں کے گاندھی نگر علاقے میں ایک مکان کرایے پر لے لیا اور وہاں پر اُسنے آئس کریم بنا کر بیچنی شروع کی۔ یہ آئس کریم وہ رات کو گھر پر بنایا کرتا تھا۔ اُسکی آئس کریم بہت جلد مقبول ہوگئی۔ جس طرح گڑ دیکھ کے مکھیاں آ جاتی ہیں اسی طرح بلی کے ہاتھ میں چار پیسے کیا آ گئے کہ اُسکے اردگرد یار دوست منڈھلانے لگے۔ بلی میں سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ وہ کسی کا بھی آگا پیچھا جانے بنا اُسے اپنا دوست بنا لیتا تھا۔ اُسکے چند ایسے یار دوست تھے جو کچھ کرتے دھرتے نہیں تھے، بس بلی کی کمائی پر اللے تللے کرتے تھے۔ اُنہوں نے بلی کا دامن تھام لیا۔ بلی نے اُنہیں اپنا شریک کار بنا لیا۔ وہ بھی اُسکے کام میں ہاتھ بٹانے لگے۔ فارمولہ بلی کا ہوتا تھا اور باقی کا کام وہ کیا کرتے تھے۔ کہتے ہیں زیادہ مٹھائی میں کیڑے پڑ جاتے ہیں۔ یہی بلی کے ساتھ ہوا۔ اُسکی کمائی دیکھ کے اُسکے دوستوں کی نیت میں کھوٹ پید ہوگئی۔ وہ اُسکے کاروباری حریف بن گئے۔ کہنے والے سچ ہی کہہ گئے ہیں گھر کا بیدی لنکا ڈھائے۔ جن کو

بلی نے سہارا دیا، اُنہیں آئس کریم بنانا سکھایا وہی آستین کے سانپ نکلے اُنہوں بلی کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا۔ جس بھاؤ میں وہ آئس کریم بیچا کرتا تھا اُنہوں نے اُسکا دھندہ چوپٹ کرنے کے لئے وہی مال آدھے دام میں بیچنا شروع کیا۔ بلی اپنے آپ کو بڑا سیانا سمجھتا تھا۔ وہ یہ بھول گیا تھا کہ سیانا کوا ہمیشہ گو کھاتا ہے۔ سیانے پن میں بلی کا دھندہ ایکدم ٹھپ ہوگیا۔ وہ اپنے کاروباری حریفوں سے مقابلہ آرائی میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ رجائی بن کے بیٹھا رہا۔ اُسے یقین تھا کہ وہ جلدی میدان چھوڑ کر چلے جائیں گے مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہ بڑے ڈھیٹ نکلے اور بلی کے سامنے مظبوطی سے ڈٹے رہے۔ پہلے اگر ہزار کا مال بکتا تھا تو وہ سو پر آ گیا۔ ایک دن ایسا بھی آیا جب اُسکا مال ہفتوں پڑا رہتا تھا۔ آئس کریم بہت نازک آئٹم ہے۔ کئی بار اُسکا مال رکھے رکھے خراب ہوگیا۔ ایک دن اُسنے یہ دھندہ بند کرلیا اور وہ جموں شہر چھوڑ کے چلا گیا۔

چند روز ادھر اُدھر بھٹکنے کے بعد اُسنے کشمیر کا رخ کرلیا۔ کشمیر کا بازار آئس کریم کے لئے زیادہ موافق نہیں تھا کیونکہ یہاں چار مہینے کڑا کے کی سردی پڑتی تھی۔ بلی اپنی قسمت آزمانا چاہتا تھا سو وہ بھٹکتے بھٹکتے ہمارے گاؤں میں آ گیا۔ اُسکی جیب میں ہزار پندرہ سو کی رقم تھی۔ ولی محمد ایک نیک بخت آدمی تھا۔ اُسنے اُسے رہنے کے لئے ایک چھوٹا سا کمرہ کرایے پر دے دیا۔ بلی کے پاس ہنر تھا۔ وہ آئس کریم بنانے میں ماہر تھا۔ اُسنے آئس کریم بنانے کی بجائے کلفی سے شروعات کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ اس میں لاگت کم نفع زیادہ تھا۔ وہ کلفی بنانے کا سامان خرید کر لایا۔ صاف اور شدھ گائے کا دودھ اُسے ولی محمد کی وساطت سے گاؤں کے ایک کسان سے ملا جس کے پاس چار چار دودھیلی گائیں تھیں۔ اُسنے رات بھر کلفی تیار کی اور اگلے روز وہ ایک ڈبے میں کلفی لے کر بس اڈے کے ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔ ایک گھنٹے کے اندر اُسکی ساری کلفی ختم ہوگئی۔ اگلے روز اُسنے دوگنی کلفی بنائی۔ وہ بھی دو گھنٹے کے اندر ختم ہوگئی۔ اُسکے ہاتھ میں جادو تھا۔ وہ ایسی کلفی بناتا تھا جس کے سواد کے کیا کہنے۔ یہ کلفی منہ میں رکھتے ہی گھل جاتی تھی۔ وہ اتنی مزیدار کلفی بناتا تھا وہ کہ کتنی بھی کھاو تسلی ہی نہیں ہوتی تھی۔ دھیرے دھیرے اُسکی کلفی اتنی مشہور ہوگئی کہ اُسنے اب ایک ٹھیلا خریدا اور کلفی کے ساتھ ساتھ وہ آئس کریم بھی بیچنے لگا۔ وہ اتنا مصروف ہوگیا کہ اُسے بمشکل ہی ایک دو گھنٹے سونے کے لئے مل جاتے تھے۔ اُسکے گھر میں ہن برس رہا تھا۔ اُسنے سوچا

کہ اب یہ کام اُسکے اکیلے کا بس نہیں اسلئے جب سردیاں شروع ہوئیں تو وہ جموں چلا گیا۔ سردیوں میں چونکہ آئس کریم کا موسم نہیں ہوتا تھا اور وہ تین مہینے کے لئے اپنے گھر چلا جاتا تھا۔

تین مہینے کے بعد جب وہ لوٹا تو وہ اکیلا نہیں تھا بلکہ اُسکے ساتھ ایک نوکر تھا جسے وہ مکی کے نام سے بلاتا تھا۔ اُسکا اصلی نام کیا تھا، مکی سے پوچھو تو وہ کچھ نہیں بولتا تھا۔ کیا بلی نے اُسکا نام تخفیف کیا تھا یا وہ اُسکا اصلی نام چھپانا چاہتا تھا، یہ تو بلی ہی جانے۔ بلی میں ایک بات تھی، وہ بڑا شکی اور خسیس قسم کا آدمی تھا۔ وہ کبھی کبھی اپنے سایے پر بھی شک کرنے لگتا تھا۔ اصل میں وہ آدم گزیدہ تھا۔ جنہیں وہ اپنا دوست، اپنا رفیق کار سمجھتا تھا وہی آستین کے سانپ نکلے۔ اُنہوں نے اُسکی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا۔ دودھ کا جلا چھاچ بھی پھونک کے پیتا ہے۔ یہی حال بلی کا تھا۔ وہ اب پرانی غلطی دہرانا نہیں چاہتا تھا اسلئے اس بار وہ ایسے لڑکے کو اپنے ساتھ لے آیا تھا جو کہ ایک اناتھ تھا۔ بلی اُسے اناتھ آشرم سے ہی اُٹھا کر لایا تھا۔ مکی جوان تھا، خوبصورت تھا، پر تھا بڑا سیدھا اور ہونق قسم کا لڑکا۔ وہ بہت کم بولتا تھا۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ وہ ہکلا کر بات کرتا تھا۔ اپنے عیب کو چھپانے کے لئے وہ اپنا منہ بہت کم کھولتا تھا۔ بلی کے لئے مکی کی یہی کمزوری اُسکے لئے وردان ثابت ہوئی تھی۔ سیٹھ لوگوں کو نوکروں کا منہ بند رکھنے کے لئے زر اور زور کا استمال کرنا پڑتا ہے۔ یہاں بلی کا نوکر تھا جس نے خود ہی اپنا منہ بند کیا ہوا تھا۔ مکی جتنا محنتی تھا اُتنا ہی ڈرپوک بھی تھا۔ بلی اُس کو ہر طرح سے پابند رکھنا چاہتا تھا۔ کہیں مکی کی نیت نہ بدل جائے یا وہ حساب کتاب میں کوئی ہیر پھیر نہ کر دے وہ مکی کو ہر رات اپنے سامنے بٹھا کر اُسے کچھ شلوک سناتا جن کے مفہوم اُسے خود بھی معلوم نہیں تھے۔ یہ شلوک پڑھ کر وہ اُسے ڈراتا رہتا تھا۔

''دیکھ بیٹا اس شلوک کا مطلب ہے کہ اگر تم ایک پیسے کی بھی چوری کرو گے تو سیدھے نرک میں جاو گے۔ پتا ہے نرک میں تمہارے ساتھ کیسا سلوک کیا جائے گا۔ تمہیں کھولتی ہوئی کڑھائی میں ڈال دیا جائے گا''

مکی جب اسطرح کی باتیں سنتا تھا تو اُس پر لرزہ طاری ہوتا تھا۔ اصل میں غربت اور لاچاری ایک انسان کو بہت ڈرپوک بنا دیتی ہے۔ یہ غریب ہے جو سب سے زیادہ خدا کی بندگی کرتا

ہے۔ پنڈت ہو یا ملا اُنکی دکانداری ان غریبوں کے دم سے چلتی ہے۔ مکی دھرم کرم کو بہت مانتا تھا۔ وہ سویرے اُٹھ کے سب سے پہلے نہاتا تھا اور پھر پوجا پاٹھ کر کے ہی ناشتہ کر لیتا تھا۔ ایمانداری اُسکی گھٹی میں پڑی تھی پھر بھی بلی کو یہ ڈر تھا کہ کہیں اُسکا ایمان نہ بگڑ جائے اسلئے وہ اُسے خوف خدا سے ہمیشہ ڈراتا رہتا تھا۔ مکی اتنا بھولا تھا کہ وہ اُسکی ہر بات پر آنکھ بند کر کے یقین کر لیتا تھا۔ اُسکے بھولے پن کا یہ عالم تھا کہ بلی خود تو ہر رات شراب پیتا تھا اور مکی کو نیک و بد سمجھاتا تھا اور وہ تھا کہ ہمہ تن گوش ہو کے سنتا تھا۔

مکی بلی کو اپنی ذاتی جائیداد کی طرح سمجھنے لگا تھا۔ وہ سارے کام مکی سے کرواتا تھا۔ خود تو وہ ہاتھ پاوں نہیں ہلاتا تھا۔ بس لاش کی طرح پڑا رہتا تھا۔ گھر کے کام تو دور اُسے اب خود آئس کریم بیچنے میں بھی لجا آتی تھی۔ اسلئے وہ مکی کو ڈھونڈ ڈھانڈ کے لے آیا تھا۔ مکی اُسکا کھانا پکاتا تھا۔ اُسکے کپڑے دھوتا تھا۔ اُسکے کمرے میں جھاڑو کٹکا لگاتا تھا۔ اُسکا بستر بچھاتا تھا۔ جب وہ پی کے اوندھے پڑتا تھا تو وہ اُسے کھینچ کر بستر پر ڈالتا تھا۔ بدلے میں اُسے بلی کی گالیاں سننے کو ملتی تھیں۔ وہ بھی نہ جانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا کہ گالیاں کھا کر بھی وہ بیزار نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ ان گالیوں کو بھی تبرک سمجھ کے اپنی آنکھوں سے لگا لیتا تھا۔

بلی رات کو مال تیار کر کے رکھتا تھا۔ مکی دس بجے کے قریب ٹھیلے پر مال رکھ کر اسے دھکیلتے ہوئے اسکول کے پاس پہنچ جایا کرتا تھا۔ لڑکوں کے اسکول کے پاس ہی لڑکیوں کا اسکول بھی تھا۔ لڑکے لڑکیاں اُسکی آئس کریم پر ٹوٹ پڑتی تھیں۔ شام کو جب وہ ڈیرے پر لوٹ جاتا تھا تو اُسکی دونوں جیبیں نوٹوں سے ٹھساٹھس بھری ہوتی تھیں۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی بلی اُسے سانس لینے کا موقع بھی نہیں دیتا تھا۔ سب سے پہلے وہ اُس سے دن بھر کی کمائی لے لیتا تھا۔ پھر اُس کی جیبوں کی تلاشی لے لیتا تھا۔ مکی ایک اصیل گھوڑے کی طرح کھڑا رہتا تھا جیسے اُسکا مالک اُس کے اوپر سے زین اُتار رہا ہو۔ دن بھر کی مشقت کے بعد بلی اُسے گھر کے کام پر لگا دیتا تھا۔ وہ بے رحم اس غریب پر ترس نہیں کھاتا تھا۔ اُسے دم لینے کی اجازت بھی نہیں دیتا تھا۔ بس اُس سے کام کرواتا رہتا تھا۔

جس دن بلی چار پہیوں والی آئس کریم کی گاڑی لے کر آیا تو مکی اسے دیکھ کے پھولے نہیں سمایا۔ واہ کیا گاڑی تھی۔ ایک طرف دیو آنند کی تصویر بنی تھی جو بلی کی آئس کریم کھا رہا تھا اور دوسری

طرف مدھو بالا کی تصویر تھی جسکے ہاتھ میں ایک نارنجی آئس کریم تھی۔ جب وہ یہ گاڑی لے کے اسکول کے پاس کھڑا ہو گیا تو لڑکے اور لڑکیاں اس گاڑی کو دیکھنے کے لئے کلاس چھوڑ کے باہر آ گئے اور حیرت و مسرت سے ملی کی اس گاڑی کو دیکھنے لگے۔ اس گاڑی کے آنے سے ملی کی بکری بڑھ گئی۔ اب اُسکے پاس قسم قسم کی آئس کریم تھی۔ چاکلیٹ، سنترہ، اشٹابری وغیرہ وغیرہ۔ لڑکیاں ملی کو اکثر چھیڑا کرتی تھیں۔ وہ جب کسی آئس کریم کا بھاو پوچھتی تھیں تو وہ اشاروں سے قیمت بتا دیتا تھا۔ سب کو یہی لگ رہا تھا کہ وہ گونگا ہے۔

ایک دن کسی لڑکے کے ساتھ اُسے پیسے کے معاملے میں تکرار ہو گئی۔ اُس دن جو اُسنے منہ کھولا تو یہ عقدہ کھلا کہ وہ گونگا نہیں بلکہ ہکلا ہے۔ بس یہ راز کھلتے ہی اُسکی مصیبت کا دور شروع ہو گیا۔ اب لڑکیاں تب تک پیسے نہیں دیتی تھیں جب تک وہ اُسکا منہ نہیں کھلواتی تھیں۔ جب وہ ہکلا کے بات کرتا تھا تو لڑکے لڑکیاں اُسکا مذاق اُڑانے لگے۔ اُس پر ہنسنے لگتے۔ ملی کو لگتا تھا جیسے وہ اُس پر ہنس نہیں رہے ہوں بلکہ اُسکے بدن کو نوچ رہے ہوں۔ اُسکے دل میں کیلیں ٹھونک رہے ہوں۔ اُنکے ان شماتت آمیز قہقہوں سے اُسکی روح مجروح ہو جاتی تھی۔

پہلے وہ کتنا بھی تھکا ماندہ ہوتا تھا، اُسکا چہرہ ہمیشہ کھلا ہوا ہوتا تھا مگر اب جب کہ لڑکے اُس کا مذاق اُڑانے لگے تھے وہ کافی اُداس اور افسردہ رہنے لگا تھا۔ بلّی کو اُس سے بس اتنا ہی لگاو تھا جیسا ایک گھر کے مالک کو اپنے کتے سے ہوتا ہے۔ وہ اُس سے دو پیار بھرے بول نہیں بولتا تھا بلکہ اُسے گالیاں دیتا تھا۔ ملی ملول ضرور ہوتا تھا مگر وہ کمزور نہیں تھا۔ وہ کبھی ہمت نہیں ہارتا تھا۔ ایک دن ملول اور غمگین رہتا تھا تو دوسرے دن وہ پھر سے معمول کی طرح کام کرنے لگتا تھا۔ آج تک کسی نے اُسے آنسو بہاتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ وقت کے سرد و گرم کو سہنے کا یارا رکھتا تھا۔ اُسنے زندگی میں کٹھنائیوں اور تکلیفوں کے سوا کچھ نہیں دیکھا تھا۔ ان سب چیزوں نے اُسے مظبوط اور سخت جان بنا دیا تھا۔

لڑکیوں کی ایک ٹولی سارہ کی رہنمائی میں جب بھی ملی کے پاس آئس کریم کھانے آتی تھی تو وہ ملی کو طرح طرح سے پریشان کرتی تھیں۔ کبھی آئس کریم میں مین میگھ نکالنے بیٹھ جاتیں۔ ڈنڈی چھوٹی کیوں ہے؟ رنگ پھیکا کیوں ہے؟ اس سے بات نہیں بنتی تو پیسے کو لے کر ہنگامہ کھڑا کر دیتی تھیں۔ ملی

کے لئے یہ لڑکیاں جب بھی آتی تھیں تو اُسکے لئے آفت کھڑی کر دیتی تھیں۔ اُنہیں دیکھتے ہی اُسکے پسینے چھوٹنے لگتے تھے۔ وہ اُسے اُلجھا کر اُسکا حساب کتاب بگاڑنا چاہتی تھیں مگر وہ اتنا تیز تھا کہ کوئی اُسے بیوقوف نہیں بنا سکتا تھا۔ اُسنے عقاب کی نظر پالی تھی۔ ایکدن کیا ہوا کہ سارہ نے ایک ایک کر کے چار آئس کریمیں ہضم کر لیں۔ جب پیسہ دینے کی نوبت آئی تو اُسنے دو کے پیسے دئے۔ کہا کہ اُسنے دو ہی آئس کریم کھالی ہیں۔ مکی کی آنکھوں میں دھول جھونکنا اتنا آسان نہ تھا۔ وہ اس جھوٹ سے تلملا اُٹھا۔ اُسنے سب کی طرف چار اُنگلیاں دکھائیں۔ مطلب یہ کہ سارہ نے چار آئس کریم کھالی ہیں۔ سارہ اپنی بات پر ڈٹی رہی کہ اُسنے دو ہی آئس کریم کھالی ہیں۔ اس بات کو لے کے تکرار شروع ہوگئی۔ اصل میں یہ سارہ کی شرارت تھی۔ مکی کو بالا آخر اپنا منہ کھولنا ہی پڑا۔ وہ چار آئس کریم کے پیسے سارہ سے وصول کرنے پر تلا رہا۔ معاملہ بڑھ گیا۔ غصے میں مکی نے سارہ کی کلائی کیا پکڑی کہ اُسنے شور مچا کر اُس پر چھیڑ چھاڑ کا الزام لگا دیا۔ بس پھر کیا تھا۔ سڑک کا یہ حصہ جو ہمیشہ شانت رہتا تھا اچانک رزم گاہ میں تبدیل ہو گیا۔ سب لڑکوں نے مل کر مکی کی جم کر پٹائی کر دی۔ جسکے ہاتھ جو لگا اُسنے وہ مکی پر مارا۔ مکی لہولہان ہو گیا۔ کوئی اُسکی صفائی سننے کے لئے تیار نہ تھا۔ کسی نے بلی کو خبر کر دی۔ وہ بھاگتا ہوا آیا۔ مکی کی مدد کرنے کی بجائے اُسنے بھی اُسے جم کے پیٹا۔ یعنی مرے پر سو درے۔ اتنے میں کسی نے پولیس کو خبر کر دی۔ وہ مکی کو پکڑ کے لے گئی۔

پولیس نے بچی کچھی کسر پوری کر دی۔ چار چوٹ کی مار کھانے کے بعد بھی مکی نہیں ٹوٹا۔ ادھر پولیس مکی کو زد کوب کرنے میں لگی تھی اُدھر بلی کی گاڑی کو لڑکوں نے توڑ پھوڑ کے رکھ دیا۔ اُسمیں بچی ہوئی آئس کریم سڑک پر بکھری پڑی تھی۔ بلی اپنی گاڑی کی حالت دیکھ کر کف افسوس ملتا رہ گیا۔ وہ مکی کے لئے نہیں رویا بلکہ اپنی گاڑی کے لئے رویا جس پر اُسکا ہزار روپیہ خرچ ہوا تھا۔ وہ اس ٹوٹی پھوٹی گاڑی کو لے کر وہاں سے چلا گیا۔

مکی دو دن پولیس لاک اپ میں بند رہا۔ اُنہیں اس بات کا ادراک ہو گیا تھا کہ وہ بے گناہ ہے اسلیئے تیسرے دن اُسے وارننگ دے کے چھوڑ دیا گیا۔ وہ جب بلی کے پاس پہنچا تو بلی نے اُسے اپنے کمرے میں گھسنے نہیں دیا۔ وہ رات بھر اُسکے گھر کے باہر بیٹھا سردی سے ٹھٹھرتا رہا۔ صبح گاوں کے چند

بڑے بزرگوں کی مداخلت کے بعد بلی نے اُسے کمرے میں گھسنے دیا۔ وہ بت بنا بیٹھا رہا۔ اُسے نہ مار پیٹ کا کوئی دکھ تھا اور نہ ہی تھانے میں دوراتیں گزارنے پر کوئی ملال۔ وہ تو بلی کے رویے سے رنجیدہ تھا۔ بلی جسے وہ اپنا سب کچھ سمجھتا تھا اُسنے بھی اُسکی بات پر یقین نہیں کیا۔ وہ ایک دن اُس سے روٹھا رہا۔ دوسرے دن اُسے اس بات کا احساس ہوگیا کہ رانی روٹھے گی اپنا سہاگ لے گی کیا کسی کا بھاگ لے گی؟ اُسکے روٹھنے سے بلی کا کچھ بھی نہیں بگڑنے والا تھا کیونکہ بلی اُسکا مالک تھا اور وہ اُسکا نوکر۔ ایک ادنی سا نوکر بھلا اپنے مالک کا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ بلی ابھی تک اُس سے ناراض تھا۔ وہ اُسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ کے غرایا۔

''کمبخت میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ تو ایسی اوچھی حرکت کرے گا؟ یہ تو تیرا نصیب اچھا ہے کہ اُنہوں نے تیرا منہ کالا کر کے تجھے گدھے پر اُلٹا بٹھا کر گاوں میں نہیں گھمایا۔ کم ظرف تیرا بیڑہ تو غرق ہوگیا ساتھ میں تیری حرکت کی وجہ سے میری لٹیا بھی ڈوب گئی۔ میں کل سے لوگوں کو کیا منہ دکھاوں گا؟ تیری ایک بھول کی وجہ سے عزت تو گئی ساتھ میں میری ہزار روپے کی گاڑی کا ستیاناس ہوگیا۔ تو نے جتنا کما کے نہیں دیا اُس سے کہیں زیادہ میرا نقصان ہوگیا۔ اب اس نقصان کی بھرپائی کون کرے گا؟ تو یا تیرا باپ؟''

مکی بہت دیر تک بلی کی جلی کٹی سنتا رہا۔ جب اُسنے پوری طرح اپنی دل کی بھڑاس نکال دی تو پہلی بار اُسنے منہ کھولا۔

''میں ۔نے ۔کو۔ئی او۔چھی حرکت نہیں کی۔ لڑکی نے حساب میں گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تھی۔ جب میں نے اُسکی چوری پکڑی تو اُسنے مجھ پر جھوٹا الزام لگایا۔''

''چپ کر'' بلی برافروختہ ہو کے چلایا۔ ''ایک تو چوری اوپر سے سینہ زوری۔ وہ لڑکی جھوٹ کیوں بولتی۔ تو نے اُسکو چھیڑا تبھی تو اُس نے شور مچایا۔ بیٹا بنا آگ کے دھواں نہیں اُٹھتا۔ اب اپنی یہ رام کتھا سنانا بند کر اور میرے ساتھ چل'' وہ اُٹھا اور اُسے ساتھ لے کے ایک فرنیچر والے کی دکان پر اپنی گاڑی لے کے چلا گیا۔ فرنیچر والے نے اُسکی گاڑی چار گھنٹے میں مرمت کر کے دے دی۔ اُسکے بعد وہ

ایک رنگ ساز کے پاس چلے گئے۔ اُسنے گاڑی میں رنگ روغن کر کے دے دیا۔ دیو آنند اور مدھو بالا کی تصویریں اس جھگڑے کی نذر ہو گئیں۔ اُسکے لئے پینٹر کی ضرورت تھی جو اس گاوں میں دستیاب نہیں تھا۔ ان تصویروں کے بنا اُسے یہ گاڑی اُدھوری اور بے رنگ سی لگی۔ اُسے ان تصویروں کے مٹ جانے کا بڑا رنج تھا مگر اس رنج کا کوئی علاج اُسکے پاس نہیں تھا۔

چوتھے روز مکی پھر اپنی گاڑی لے کے اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ وہ جیسے اندر سے بجھ گیا تھا۔ چہرے پر جو شادابی ہوا کرتی تھی وہ جیسے اُڑن چھو ہو گئی تھی۔ جن لڑکوں نے اُسے مارا پیٹا تھا وہ اُس سے آنکھیں نہیں ملا پا رہے تھے۔ مکی کو تو اُن کے چہرے یاد ہی نہیں تھے جنہوں نے اُسے پیٹا تھا۔ اتنے میں سارہ اپنی ٹولی کے ساتھ آئی۔ آج اُسکی چال میں وہ نزاکت نہیں تھی اور نہ ہی چہرے پر وہ شوخی۔ وہ اُسکی گاڑی کے سامنے سے سر جھکائے گزر گئی۔ چند لمحوں کے لئے مکی کا دل دھڑ کا ضرور مگر اُسکے جاتے ہی اُسکے کلیجے میں ایک درد کی لہر سنسناتے ہوئے گزر گئی۔ وہ روہانسا ہو کے بہت دیر تک کھڑا رہا۔

دو تین دن سارہ اُسکے سامنے سے گزرتی اور اُسکی طرف دیکھے بنا چلی جاتی۔ وہ حیران و پریشان تھا کہ آخر وہ اُسکے سامنے آنے سے کتراتی کیوں ہے۔ کیا اُسکا ضمیر اُسے اندر ہی اندر کچوکے مار رہا ہے کیونکہ اُسکی ندامت سے یہ بات مظہر تھی کہ اُسنے مکی پر جھوٹا الزام لگایا تھا اور اس غریب کو مصیبت میں ڈال دیا تھا پر وہ اپنی بھول کا اعتراف بھی نہیں کرنا چاہتی تھی کیونکہ ایسا کرنے سے اُس کی بدنامی ہو جاتی۔

ایک ہفتے تک یہ آنکھ مچولی کا کھیل چلتا رہا۔ ایک ہفتے کے بعد وہ ایک دن مکی کے سامنے آ گئی۔ اُسکی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ مکی نے اُسکی پسند کی آئس کریم اُسکی طرف بڑھائی۔ اُسنے نظر اُٹھا کے جو مکی کی طرف دیکھا تو ایک پل کے لئے اُسکا کلیجہ پھٹ پڑا۔ مکی کا بھولا بھالا چہرہ دیکھ کے اُسے اس غریب پر رحم آ گیا۔ وہ دس روپے کا نوٹ جب اُسکی طرف بڑھانے لگی تو اُسنے دیکھا کہ مکی کی آنکھیں اشک بار تھیں۔ وہ سوالیہ نظروں سے سارہ کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے اُس سے پوچھ رہا ہو کہ اُسنے اُس پر جھوٹا الزام کیوں لگایا۔؟ کیوں اُسے لڑکوں سے پٹوایا؟ سارہ ان نگاہوں کی تاب نہ لا سکی۔ اُسکا غم زدہ چہرہ دیکھ کے اُسکا کلیجہ پھٹنے لگا۔ وہ غصیلی ضرور تھی پر تھی وہ بڑی جذباتی۔ وہ جذبات کے غلبے میں اس طرح آ گئی کہ

اُسنے مکی کے سامنے اپنی بھول کا اعتراف کیا۔

''اُس دن جو کچھ ہوا اُسمیں کچھ بھی سچ نہیں تھا۔ میں نے تم سے شرارت کی تھی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ میری اس نادانی کی تمہیں اتنی سنگین سزا ملے گی۔ ہو سکے تو مجھے معاف کرنا۔''

مکی جو بوجھ اپنے دل پر کئی دنوں سے لے کے بیٹھا تھا۔ سارہ کے اعتراف کے بعد اُس کے دل پر سے وہ بوجھ ہٹ گیا تھا اور اسکے بعد وہ ایسے رویا جیسے ساون بھادون کی جھڑی لگ گئی ہو۔ جتنے بھی آنسو اُسنے دل کے نہاں خانوں میں چھپا کے رکھے تھے، وہ سارے آنسو اُس نے اُس دن ایک ساتھ بہادئے۔ اُسے اس طرح پھپھک پھپھک کے روتے دیکھ کر سارہ بھی جذباتی ہو کر رو پڑی۔ اُن دونوں کو یوں روتے دیکھ کر سبھی حیران و ششدر تھے۔

جب وہ ڈیرے پر پہونچا تو وہ خوش بھی تھا اور ساتھ ہی رو بھی رہا تھا۔ بلی نے جب اُسے اس حال میں دیکھا تو وہ چونک پڑا۔ اُسنے حیران ہو کے پوچھا۔

''اوئے یہ ٹسوئے کس خوشی میں بہا رہے ہو؟''

''لڑکی نے مان لیا کہ اُسنے اُسے ستانے کے لئے یہ جھوٹ بولا تھا۔ وہ آج مجھ سے معافی مانگنے آئی تھی''

بلی کو اُسکے رک رک کر بولنے سے بڑی کوفت ہوتی تھی۔ وہ جھنجلا کے بولا۔

''اُسکے کہنے سے تمہارے ماتھے پر لگا کالا دھبہ دھل نہیں سکتا۔ جو بدنامی کا داغ تمہارے ماتھے پر لگا ہے وہ سات جنموں تک تمہارے ساتھ لگا رہے گا۔ تم نے وہ محاورہ سنا ہی ہوگا۔ بدا چھا بدنام برا۔ بدنامی مرتے دم تک ساتھ نہیں چھوڑتی۔''

مکی غریب ضرور تھا مگر تھا بڑا غیرت مند۔ اُسکا کردار کسی فرشتے کی طرح صاف و پاک تھا۔ بلی کے کہنے کے بعد اُسے لگا جیسے سارہ نے اُسکے پاک وصاف و کردار پر گرہن لگا دیا ہو۔ سارہ کا اپنی بھول کا اعتراف کرنے کے بعد جو خوشی اُسے ملی تھی وہ خوشی بلی کے بکھان کے بعد معدوم ہو گئی تھی اور بلی کی ایک ایک بات اُس کے دل و دماغ پر چابک کی طرح برستی رہی۔

وہ اُس رات سو نہیں سکا۔ بس پوری رات آٹھ آٹھ آنسو روتا رہا۔ اس الزام نے اُسکے

وجود کا پارہ پارہ کر کے رکھ دیا تھا۔ یہ مذاق اُسے برمے کی طرح اندر تک چھید کے گیا تھا، وہ اس بوجھ سے ابھی تک آزاد نہیں ہوا تھا۔ وہ اس جھوٹے الزام کے بوجھ سے اتنا دکھی تھا کہ اگلے روز بلی کے گھر سے اُسکی لاش ملی۔ اُسنے خودکشی کرلی تھی۔



زندان

محمد سلطان ٹنگمرگ کے ایک کچے مکان میں جو کہ فیروز پور نالے کے کنارے واقع تھا اپنی بیوی اور اپنے اکلوتے بیٹے کے ساتھ رہتا تھا۔ فیروز پور نالہ گلمرگ کی پہاڑیوں کی کوکھ سے پھوٹ کر اپنے ساتھ چھوٹی چھوٹی دھاراوں کو ملا کر آگے بڑھتا تھا اور پھر ایک نالے کی شکل اختیار کرتا تھا۔ اس نالے میں چھوٹے بڑے گول پتھر وافر مقدار میں موجود تھے۔ جب پانی ان پتھروں سے ٹکراتا تھا تو ایک آہنگ پیدا ہو جاتا تھا جو ایک سنگیت کی کیفیت پیدا کرتا تھا۔ حالانکہ اُس کا گھر کچا تھا۔ چھت گھاس پھوس کی تھی مگر جس ڈھلان پر اسکا گھر تھا اُسکے سامنے کا نظارہ قابل دید تھا۔ گھر کے سامنے ایک دیو قامت پہاڑ سینہ تانے کھڑا تھا جو چیڑھ اور دیودار کے درختوں سے لہر بہر تھا۔ یہ پیڑ ایک دوسرے کے سامنے ایسے کھڑے تھے جیسے آپس میں محو گفتگو ہوں۔ گو کہ اُسکا گھر ایک ٹیلے پر آباد تھا مگر وہ تین اطراف سے پہاڑوں سے گھرا ہوا تھا۔ سورج کی سنہری کرنیں جب مشرقی پہاڑیوں سے چھن کے باہر آتی تھیں تو یہ سنہری کرنیں سب سے پہلے محمد سلطان کے گھر کا بوسہ لیتی تھیں۔ یہاں سورج کا پرتو سب سے پہلے پڑتا تھا اور شام کو سورج جلدی غروب ہوتا تھا۔ شام کو جب ڈوبتا سورج اُفق کے گالوں پر شفق زار کھلا دیتا تھا تو محمد سلطان کو یہ من موہنا منظر کسی دلفریب پینٹنگ کی طرح لگتا تھا۔ گرمیوں میں جب ان پہاڑیوں پر سے ٹھنڈی پروائیں چلتی تھیں تو محمد سلطان کو لگتا تھا جیسے یہ ہوا کے جھونکے جنت سے ہو کے آئے ہیں۔ اسنے اپنے گھر کے آنگن میں اخروٹ کا ایک پیڑ بچپن میں لگایا تھا جو کہ اب ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر چکا تھا اور موسم گرما میں اُسکی ڈالیاں اخروٹوں سے لدی پھندی ہوتی تھیں۔ جب کبھی وہ اس اخروٹ کے درخت کے سایے میں بیٹھ

جاتا تھا تو ایک الگ قسم کی خوشی و فرحت کا احساس اُسکے دل میں ہلکورے مارنے لگتا تھا۔ اس خوشی کے احساس میں ایک جذباتی ہم آہنگی تھی کیونکہ یہ پیڑ اُسنے اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا جو آج اپنے جوبن پہ تھا۔ رات کو جب وہ سوتا تھا تو فیروز پور نالہ اُسے اپنے سنگیت سے مسحور کر کے رکھ دیتا تھا۔ وہ اس سنگیت کا ایسا عادی ہو چکا تھا کہ جس دن وہ کسی رشتہ دار کے یہاں چلا جاتا تھا تو اُسے نیند نہیں آتی تھی۔ اُسکے کان اس سنگیت سے اسقدر مانوس ہو چکے تھے کہ اُسے سنے بنا اُسے نیند نہیں آتی تھی۔

اُسے اپنا یہ چھوٹا سا گاوں بہت پسند تھا۔ وہ جب کھیتوں کی منڈھیروں سے گزرتا تھا تو کہیں مکئی کے کھیت تو کہیں دھان کی کھیتی اُسکے دل کو گدگداتی تھی۔ سردیوں میں جب سرسوں کے کھیت لہلہاتے تھے تو ایسا لگتا تھا جیسے ننھے منے بالک اپنے سروں پر پیلی ٹوپیاں پہنے ہوا سے اٹھکلیاں کر رہے ہوں۔ وہ گاوں کی چوپال پر جا کے بیٹھ جاتا تھا جہاں گاوں کے بڑے بزرگ بیٹھ کر ہنسی ٹھٹھول کرتے تھے۔ کتنا صاف اور پاک تھا اس گاوں کا ماحول۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ گاوں نہ ہو ایک کنبہ ہو۔ ایک سموہ ہو جہاں ہر دکھ سانجھا اور ہر سکھ اپنا ہو۔ محمد سلطان گھنٹوں چوپال میں جا کے بیٹھ جاتا تھا اور بزرگوں کی باتیں ہمہ تن گوش ہو کے سنتا تھا۔

محمد سلطان بہت غریب تھا۔ وہ ہمیشہ تنگ دستی کا رونا روتا تھا۔ گو کہ اُسکے پاس تھوڑی بہت زمین تھی مگر اس زمین سے جتنی پیداوار ہوتی تھی اُس سے سال بھر کے لئے پیٹ نہیں بھرا جا سکتا تھا۔ اپنے پریوار کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے وہ گرمیوں میں گھوڑ بانی کا کام کرتا تھا۔ گھوڑ بانی حالانکہ اُسکا پیشہ نہیں تھا مگر گھر کیا اخراجات کو مدنظر رکھتے ہوئے اُسے یہ کام کرنا پڑ رہا تھا۔ تین چار مہینے سیاحوں کا خوب رش رہتا تھا۔ محمد سلطان ٹورسٹ سیزن میں چار پیسے کما لیتا تھا جو سردیوں کے موسم میں کام آتے تھے۔

محمد سلطان کی بیوی امینہ جب دلہن بن کے آئی تھی تو جو اُسے دیکھتا تھا تو بس دیکھتا ہی رہ جاتا تھا۔ اتنی خوبصورت تھی وہ۔ چھریرا بدن۔ تیکھے ناک نقوش۔ دو نیلی آنکھیں۔ وہ آنکھیں نہیں جیسے دو نیلگوں جھیل تھے جن کی گہرائیوں میں ڈوبنے کا جی کرتا تھا۔ غربت اور افلاس کے دیمک نے اُسے اسطرح

سے چاٹنا شروع کیا کہ دو چار برسوں میں اُسکی موہنی ماند پڑنے لگی اور وہ خزان زدہ پھول کی طرح کمھلانے لگی۔ اسی ناداری کے سبب اُسنے تین بچے کھودئے تھے۔ بروقت علاج نہ ملنے کے سبب اُسکے تین بچے پیدا ہونے کے چند ہفتے بعد لقمہ اجل ہو گئے۔ بس ایک بچہ ہی جی پایا جسے اُس نے غربت کے اس دلدل میں گرنے سے بچانے کے لئے پڑھایا لکھایا۔ وہ خود ان پڑھ تھا مگر وہ اپنے بچے کو پڑھانا لکھانا چاہتا تھا۔ اُسے علم کی ضیا سے منور ہوتے دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ اپنی بدبختی کا سایہ اُس پر پڑنے نہیں دینا چاہتا تھا۔ اُسکی ماں کی بھی یہی تمنا تھی کہ اُسکا بچہ پڑھ لکھ کے بڑا آدمی بن جائے۔ ماں باپ دن رات محنت کر کے اُسے پڑھاتے رہے۔ محمد سلطان نے دل ہی دل میں یہ عہد کیا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو ڈاکٹر بنا کے رہے گا۔ اسکی بات سن کے اس علاقے کے سرمایہ دار اُسکا مذاق اُڑایا کرتے تھے۔ اس گاوں کے متوسط طبقے کے لوگ اس کی بات کو دیوانے کی بڑ سمجھتے تھے کیونکہ ڈاکٹری پڑھانا متوسط طبقے کے لوگوں کے بس کی بات نہ تھی۔ اس کے لئے لاکھوں روپے درکار تھے۔ محمد سلطان تو چکی پیس کر گزارہ کرتا تھا۔ اُسکے لئے اس طرح کی باتیں کرنا شیخ چلی کے خواب دیکھنا جیسا تھا۔ جو آدمی اپنے بال بچوں کا پیٹ مشکل سے پال رہا تھا وہ اپنے بیٹے کو ڈاکٹر کیسے بنا پاتا۔ ڈاکٹری پڑھانے کے لئے تو لاکھوں روپے درکار تھے، اتنے سارے روپے کہاں سے لاتا وہ۔ وہ کہتے ہیں نا کہ جہاں چاہ وہاں راہ۔ محمد سلطان نے یہ ٹھان لی تھی کہ چاہے دنیا ادھر سے اُدھر ہو جائے۔ اُسکا بال بال قرض میں ڈوب جائے وہ اپنے اس خواب کو پائے تکمیل تک پہونچا کر ہی دم لے گا۔ پہلے وہ سردیوں میں گھر میں پڑا رہتا تھا مگر اب وہ سردیوں میں بھی مزدوری کرتا تھا۔ کبھی بجری بچھانے کا کام کرتا تو کبھی شہتیریں ڈھوتا تھا۔ جب اس سے عادل کی ضرورتیں پوری نہیں ہوئی تو اُسنے دھیرے دھیرے اپنی زمینیں بیچ ڈالیں۔ پاس پڑوسیوں کو لگا کہ وہ پاگل ہو چکا ہے۔ کوئی کسان بھلا اپنی زمین بیچتا ہے۔ زمین سے ہی کسان کی پہچان ہوتی ہے۔ اُنہوں نے اُسے روکنے کی کوشش کی مگر پاس پڑوسیوں کے منع کرنے اور رشتہ داروں کے سمجھانے بجھانے کے باوجود اُسنے ٹکڑے ٹکڑے اپنی زمین بیچ دی۔ اُنہی سرمایہ داروں کے ہاتھوں جو اُس کا مذاق اُڑا رہے تھے۔ یہ سب کچھ وہ مجبوری میں کر رہا تھا۔ زمین بیچتے وقت اُسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے جسم کے انگ بیچ رہا ہو مگر بچے کو پڑھانے کے لئے اور

کوئی آسرا نہ تھا۔ اُسنے اپنے بچے کو مزید پڑھائی کے لئے وادی سے باہر بھیج دیا۔

اس علاقے میں دو چار متمول لوگ تھے جو خود رہتے تو شہر میں تھے مگر یہاں اُنہوں نے کافی زمینیں خرید کے رکھی تھیں اور جن سے یہ زمینیں خریدیں تھیں وہی لوگ اُنکی چاکری کرتے تھے۔ اُن میں سے ایک محمد سلطان بھی تھا۔ شروع شروع میں یہ مالدار لوگ اُسکی مدد کرتے تھے مگر جب سے اُس نے اپنے بیٹے کو مزید پڑھائی کے لئے باہر بھیج دیا تھا، انکے سینوں پر سانپ لوٹنے لگے تھے۔ ایک غریب نادار اُن سے آگے نکل جائے یہ سب وہ کیسے برداشت کر سکتے تھے اسلئے اُنہوں نے سلطان کا بہانے بہانے سے قافیہ تنگ کرنا شروع کیا۔ وہ اُسے کام پر کم ہی بلاتے تھے۔ جب بھی بلاتے تھے تو اُسکے زخموں پر نمک چھڑکتے تھے۔ وہ چپ چاپ زہر کے گھونٹ پی کے رہ جاتا تھا۔ اسی بیچ اُسکی رفیقہ حیات اُسکا ساتھ چھوڑ گئی اور وہ اکیلا رہ گیا۔ اب جب کہ اُسکی جوانی بھی ساتھ چھوڑ گئی تھی ایسی عمر میں جیون ساتھی کا بچھڑ جانا اُسکے لئے بہت بڑا زیاں تھا۔ اب اُسمیں وہ دم خم بھی نہ رہا تھا جو وہ اکیلے حالات سے نبرد آزما ہو پاتا۔ بیوی ہوتی تو زندگی کا کٹھن سفر بڑا آسان ہو جاتا مگر اوپر والے کی مرضی کا کیجئے۔ موت تو ایک نہ ایک دن سب کو آنی ہے مگر امینہ کا یوں چلے جانا اسکے لئے پہاڑ ٹوٹنے سے کم نہ تھا۔ بہر حال وہ اس آس پر جی رہا تھا کہ کل جب اُسکا بیٹا عادل ڈاکٹر بن جائے گا تو اُسکی زندگی کا مقصد ہی نہیں پورا ہو جائے گا بلکہ اُس کی زندگی پر چھایا یہ غم کا اندھیر بھی چھٹ جائے گا اور اُسکا دامن خوشیوں سے بھر جائے گا۔

ایک دن اُسکا دیرینہ خواب سچ مچ پورا ہوا۔ عادل ڈاکٹر بن کے لوٹا تو اُسے لگا جیسے سارے جہاں کی خوشیاں اُسے مل گئی ہوں۔ عادل کو بغیر کسی تگ و دو کے شہر کے بڑے اسپتال میں نوکری مل گئی۔ اُس دن محمد سلطان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح پورے گاوں میں گھوما اور ایک ایک فرد کو یہ خوشخبری سنائی۔ بیٹے نے بھی اپنا فرض نبھایا۔ وہ اپنے باپ کو گاوں سے اُٹھا کر شہر لے آیا حالانکہ وہ شہر میں رہنا نہیں چاہتا تھا مگر بیٹے کی خوشی کی خاطر اُسنے اُسکا دل توڑنا مناسب نہیں سمجھا اور نہ چاہ کر بھی وہ اُسکے ساتھ شہر چلا آیا۔ اُسکے ساتھ صنم نامی ایک لیڈی ڈاکٹر کام کرتی تھی۔ وہ ایک رئیس باپ کی لاڈلی بیٹی تھی۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں اور دل میں پیار پنپنے لگا۔ جلد ہی دونوں نے شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔

چٹ منگنی اور پٹ بیاہ ہوگیا۔شادی ہوتے ہی عادل کے وارے نیارے ہوگئے۔صنم نے اُسکی زندگی ہی بدل کے رکھ دی۔ایک کچے مکان میں پلنے والا عادل بنگلے میں رہنے لگا۔گھوڑا چلانے والے کا بیٹا اب قیمتی کار میں گھومنے لگا۔اب اُن کے گھر میں نوکر چاکر تھے۔اُسکے سسر نے اُسے ایک کلنک کھول کے دیا۔دیکھتے ہی دیکھتے وہ شہر کا ایک نامی ڈاکٹر بن گیا۔آٹھ دس سالوں میں اُسنے سب کچھ پالیا۔عزت، شہرت اور پیسہ۔ دونوں نوکریاں چھوڑ کے کلنک میں بیٹھ جاتے تھے۔دونوں صبح سے لے کے رات گئے تک اپنے کام میں مصروف رہتے تھے۔کلنک کے باہر مریضوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔کبھی کبھی تو آدھی رات تک اُنہیں کلنک میں ہی بیٹھنا پڑتا تھا۔گھر میں ہن برس رہا تھا۔رات کو جب وہ گھر لوٹتے تھے تو اپنے ساتھ اتنے سارے نوٹ لے کے آجاتے تھے جن کی گنتی کرنے کی بھی اُنہیں فرصت نہیں ملتی تھی۔

محمد سلطان کھلی وادیوں اور کھلی فضاوں کا پروردہ تھا۔گو کہ اُسے ہر آسائش اور آرام میسر تھا مگر پھر بھی شہر میں اُس کا دل نہیں لگتا تھا۔اُسے رہ رہ کے اپنا گاوں یاد آتا تھا۔وہ کھیت کھلیان، وہ سرسبز چراگاہیں، وہ فیروز پور نالے کا قل قل کرتا پانی، وہ اُسکا آہنگ، وہ اُڑتے ہوئے بادل کے ٹکڑے، وہ سرسوں کے کھیت، وہ مکئی کے بوٹے، وہ کچے اور پکے اخروٹ، وہ بید اور چیڑھ کے خنک سایے، وہ کھیتوں کی منڈھیریں، وہ کچی پگڈنڈیاں، وہ دھول اُڑاتے گائے اور بیل کے جھنڈ، وہ ممناتے بکریوں کے میمنے، وہ برف پوش چوٹیاں، وہ جنگل کی سائیں سائیں، وہ رات کا سکوت اور چاندنی راتیں۔ وہ رات کو مینڈکوں کا ٹرٹرانا۔وہ سویرے سویرے بلبلوں کا چہکنا۔یہاں تو یہ ساری چیزیں عنقا تھیں۔ یہاں دھول اُڑاتی اور شور مچاتی موٹر گاڑیاں تھیں۔بلڈنگوں کا کنکریٹ جنگل تھا۔یہاں نہ رواداری تھی نہ یکسوئی۔ یہاں ہر شخص اُسے اجنبی اور بیگانہ لگتا تھا۔اس ماحول میں اُسکا دم گھٹنے لگا تھا۔وہ جیسے اس چار دیواری میں قید ہو کر رہ گیا تھا۔وہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے گاوں چلا جاتا تھا اور اپنے سنگی ساتھیوں کے ساتھ بیٹھ کر خوب چہل بازی کرتا۔وہ کئی کئی ہفتے اپنے گھر میں گزارا کرتا تھا۔گھر پہنچ کر اور اپنے لوگوں سے مل کر اُس کے دل کو ایک اتھاہ سکون اور بے انتہا خوشی ملتی تھی۔وہ گھنٹوں چوپال پر بیٹھ کر گاوں کے بزرگوں سے دل کھول کے باتیں کرتا تھا۔جب بہو اور بیٹے کی یاد آتی تھی تو وہ بس میں بیٹھ کر بیٹے اور بہو سے ملنے شہر چلا جاتا تھا۔

اُسمیں رتی بھر بھی بدلاؤ نہیں آیا تھا۔ وہ آج بھی عجز وانکساری سے جی رہا تھا۔ بیٹا اور بہو شہر کے مشہور ڈاکٹر ہونے کے باوجود وہ اُسی سادگی اور ندامت کے ساتھ جی رہا تھا۔ گھمنڈ نام کی چیز اُس سے کوسوں دور تھی۔

ایک دن جب وہ اپنے بیٹے کے پاس شہر میں تھا تو تبھی اُسے اپنے گاوں کا ایک پڑوسی ملا جس کی زبانی اُسے پتا چلا کہ عادل نے اُس کا آبائی مکان بیچ دیا ہے۔ اُس نے جب یہ خبر سنی تو وہ تیورا کے نیچے گرا۔ اُس دن اُسے لگا جیسے اُسکی زندگی کا سرمایہ اُس سے چھن گیا ہو۔ ہ گھر نہیں اُسکا آستانہ تھا۔ اسی گھر میں اُسنے خود جنم لیا۔ اسی گھر میں امینہ دلہن بن کر آئی تھی۔ اسی گھر میں عادل نے جنم لیا تھا۔ یہ گھر نہیں اُسکی یادوں کا ایک گلدستہ تھا۔ اُسکے ماضی کا ایک مرقع تھا۔ جب اُسکے حواس بحال ہوئے تو اُسنے اپنے بیٹے عادل سے پوچھا۔

''یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ تم نے گاوں کا مکان بیچ ڈالا؟''

''ہاں ابا میں نے وہ مکان بیچ دیا ہے''

''مجھ سے پوچھے بنا تم نے اتنا بڑا فیصلہ کیسے لیا؟''

''اسمیں تم سے پوچھنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ مکان اب رہنے کے لائق نہیں رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر وہ پیسہ میں اپنے کلنک میں ڈال دوں تو ایک سال میں یہ پیسے دگنے ہو جائیں گے۔ اب اس مکان میں ہم لوگ رہنے والے تو ہیں نہیں، ایسے میں اُس ٹوٹے پھوٹے کچے مکان کو رکھ کے ہمیں کیا ملتا؟''

محمد سلطان نے دکھ اور صدمے سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھ کے کہا۔

''اتنی جلدی اُس گھر کو بھول گئے جہاں تم نے آنکھیں کھولی تھیں، جہاں تمہارا بچپن گزرا۔ ارے تمہارے لئے وہ ایک بیکار چیز تھی مگر میرے لئے تو وہ میرے ارمانوں کا محل تھا۔ وہ میری یادوں کا گہوارہ تھا۔ میری محبت کا تاج محل۔ تم نے مجھ سے میرا ماضی ہی چھین لیا۔''

کہہ کر وہ زار زار رونے لگا۔ عادل نے اُسے چپ کرانے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ وہ اُٹھ کر اپنے کلنک چلا گیا۔

اس دن عادل کے یوں بے نیازی سے اُٹھ کے چلا جانے سے اُسکا کلیجہ کرچی کرچی ہو کے رہ گیا۔ اُسکے دل کو گہرا دھچکا لگا۔ اُسے واقعے کے بعد محمد سلطان کا من اُچاٹ اور افسردہ رہنے لگا۔ اُسے اپنا گاوں اپنا گھر شدت سے یاد آنے لگا۔ وہ سوچنے لگا کہ اب اگر وہ گاوں جائے گا تو کہاں رہے گا؟ اُسکا مسکن تو بک چکا تھا۔ اُسکا آشیانہ تو چھن چکا تھا۔ گھر کی یاد آتے ہی اُسکا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ اُسنے سوچا کہ اب اُسکی زندگی کا مصرف کیا ہے۔ وہ ایک ایسے بلبل کی طرح ہے جسے پنجرے میں قید کیا گیا ہو۔ ایک دن عادل کلنک سے جلدی لوٹا اور باپ کے پاس بیٹھ کر اُس سے بولا۔

''ابا میں چاہتا ہوں کہ تم فریضہ حج ادا کرو۔ میں نے سارا بندوبست کرلیا ہے۔ تمہارا پاسپورٹ ایک دو دن میں بن کے آجائے گا۔ اُسکے بعد میں تمہارا ٹکٹ بک کروالوں گا۔ تم خرچے پانی کی بالکل فکر مت کرنا۔ اب تو تم خوش ہونا؟''

محمد سلطان کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ پھیلی۔ وہ زبان سے کچھ نہیں بولا بس اپنا ہاتھ بیٹے کے سر پر پھیرلیا۔ تھوڑے توقف کے بعد اُسنے بیٹے سے کہا۔

''میں چاہتا ہوں کہ گاوں جا کر سب سے رخصت لوں۔ کیا پتا کہ لوٹ کے آوں گا کہ نہیں''

''ایسا کیوں سوچتے ہو ابا''

''بیٹا زندگی کا کیا بھروسہ۔ آج مرے تو کل دوسرا دن''

''تم گاوں جانا چاہتے ہو تو ضرور جاو پر اپنی گاڑی میں بیٹھ کے جانا۔ سرکاری بس میں نہیں۔ میں ڈرائیور کو کہہ دوں گا وہ تمہیں لے کے جائے گا۔''

''بیٹا زندگی بھر میں نے گھوڑے کی سواری کی۔ گاڑی میں بیٹھ کر مجھے وحشت ہوتی ہے۔ مجھے اپنے حساب سے جانے دو۔ میں کل صبح تک لوٹ آوں گا''

''ابا کچھ میرے رتبے کا تو خیال کرو۔ صنم بھی اس بات سے خفا ہے کہ تم وہی مزدوروں والے کپڑے پہنتے ہو۔ قراقلی کی جگہ یہ سستی سی ٹوپی پہنتے ہو۔ صنم کو یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا ہے۔ ابا اپنے

آپ کو بدلنے کی کوشش کرو۔"

"میں سمجھ گیا بیٹا ۔ میں سمجھ گیا۔تم لوگوں کو میری اس سادگی سے پریشانی ہو رہی ہوگی ۔کیا کروں بیٹا میں اپنی فطرت بدل نہیں پا رہا ہوں۔خیر یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی ۔ابھی مجھے جانے دو۔میں ایک دو دن میں لوٹ کے آجاوں گا۔"

"ٹھیک ہے"

وہ بیٹے اور بہو سے رخصت لے کے چلا گیا۔

عادل اور صنم اپنے کام میں اسقدر مصروف تھے کہ وہ دو دن کے لئے ابا کو بھول ہی گئے کیونکہ محمد سلطان یہ بول کے گیا تھا کہ وہ ایک دو دن میں لوٹ کے آئے گا۔اب تو تین دن گزر چکے تھے اور محمد سلطان گھر نہیں لوٹا تھا تو عادل کو فکر ہونے لگی۔وہ رات بھر ابا کا انتظار کرنے لگا۔جب وہ چوتھے روز بھی گھر نہیں لوٹا تو اب کے عادل کو کافی فکر و تشویش ہونے لگی۔وہ منہ اندھیرے ہی گاوں کے لئے نکل گیا ۔جب وہ گاوں پہنچا تو اُسنے اُسے اُسکے یار دوستوں کے یہاں تلاش کیا۔جب وہ وہاں نہیں ملا تو وہ اُسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے اپنے اُس آبائی گھر تک پہنچ گیا جہاں اب گھر تو نہیں تھا بس گھر کا ملبہ تھا۔نئے مالک نے پرانا گھر گرادیا تھا۔جب وہ اس ملبے کے قریب پہنچا تو اُسنے دیکھا کہ ملبے کے ڈھیر کے اُس پار بہت سارے لوگ جمع تھے۔بھیڑ دیکھ کر وہ دنگ رہ گیا۔وہ جب بھیڑ کو چیرتے ہوئے آگے بڑھا تو یہ دیکھ کر وہ دھک سے رہ گیا کہ اُسکے باپ کی لاش اُسی اخروٹ کے نیچے پڑی تھی جسے اُسنے اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا۔اُسکی آنکھیں کھلی تھیں جیسے یہ آنکھیں اپنے اُس گھر کو تلاش کر رہی تھیں جو اُس سے چھن گیا تھا۔عادل اپنے باپ کی لاش پر گر کر بین کرنے لگا۔

☆☆

نرگس کے آنسو

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب بادام کے شگوفے کھلے تھے۔ جب نرگس کے پھولوں نے اپنی خوابیدہ آنکھیں وا کی تھیں۔ جب یاسمین کے قرمزی پھولوں نے فضا کو اپنی نکہت سے شرابور کر دیا تھا۔ یہ بات بسنت کے ابتدائی دنوں کی ہے جو اپنے ساتھ تازگی اور ہریالی لیکر آتا ہے۔ بسنت کے ان ہی خوشگوار ہوا کے جھونکوں کا لمس پا کر دھرتی کی کوکھ میں چھپے وہ سارے بیج پھوٹنے لگتے ہیں جن کی تخم ریزی خزان جاتے جاتے کر جاتا ہے۔ زمستان کے قہر کے بعد دھرتی کے یہ بدلتے ہوئے رنگ وروپ بڑے دلفریب اور من موہنے ہوتے ہیں۔ دھرتی ایک سانپ کی طرح اپنے بدن سے پرانی کینچلی اُتار کر نئے رنگ وروپ میں جلوہ افروز ہونے لگتی ہے۔ ہر طرف سبزے کی مخملی چادر بچھ جاتی ہے اور اس چادر پر پھول اور کلیاں اس طرح سجنے لگتی ہیں جیسے دھرتی پر کسی نے گلکاری کی ہو۔ اس وادی کا ہر منظر دلکش اور دل فریب ہے۔ مجھے قدرت کی ہر شے حسین لگتی ہے مگر مجھے سب سے پیارے اور لبھاونے بادام کے وہ سپید اور ہلکے گلابی رنگ کے شگوفے لگتے ہیں جنہیں دیکھ کر ایسا گمان گزرتا ہے جیسے بے شمار نوزائیدہ بچے سر پر ہلکے گلابی رنگ کی ٹوپیاں پہن کر ماں کی بانہوں میں ہمک رہے ہوں۔ اُسکے بعد یہی شگوفے باداموں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ بادام کے یہ پھل پکھراج کے دانوں کی طرح لگتے ہیں۔ میں آفریدکار کی صناعی دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہوں۔ قدرت کا نظام کتنا منظّم ہے۔ کتنا پیچیدہ ہے۔ کتنا پُر اسرار ہے میں اسے آج تک سمجھ ہی نہیں پایا۔ میں کیا بڑے بڑے رشی منی اور سادھو سنت بھی ان سارے اسرار و رموز کو سمجھنے میں ناکام رہے۔ اسی

تجسس نے اُنہیں جنگلوں اور نخلستانوں کی خاک چھاننے پر مجبور کیا مگر وہ پھر بھی تشنہ طلب ہی رہے۔

مجھے وہ ہر چیز پسند ہے جو حسین ہو جیسے ڈل کی یہ جھیل۔ کمل کے یہ پھول، ان پھلوں پر پنکھ ہلاتی یہ رنگ برنگی تتلیاں۔ پانی سے لپٹے ہوئے یہ کمل کے پتے جیسے ماں کی چھاتی سے چمٹے نوزائیدہ بچے۔ یہ نیلگوں پانی اور اسکا خرام۔ پانی پر تیرتے ہوئے یہ رنگ برنگی شکارے۔ دلہن کی طرح سجے سجائے۔ مجھے قدرت کی ہر حسین چیز پسند ہے۔ وہ چاہے جھیل ہوں یا تالاب۔ جھرنے ہوں یا آبشار، پھول ہوں یا کلیاں، شگوفے ہوں یا پنکھڑیاں۔ یا کوئی حسین عورت۔ عورت تو ایک خاصے کی چیز ہے جسے اس کائنات کے صناع کارنے بڑی نزاکت اور نفاست سے بنایا ہے مجھے یہ سب چیزیں پسند ہیں مگر مجھے اُداس چہرے پسند نہیں ہیں۔ اُسکا وہ اداس اور افسردہ چہرہ ہمیشہ میرے لئے ایک سوال بن کر رہ جاتا تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ میں قنوطیت پسند نہیں ہوں۔ میں تو امید فردا پر جینے والا انسان ہوں جو بدترین حالات میں بھی اُمید کے سہارے جینے کا خوگر رہا ہے۔ ایسے میں اُس عورت کی تئیں میری نفرت واجبی تھی۔

میں جس عورت کی بات کر رہا ہوں وہ اسی گاؤں رہتی تھی جہاں میرا قیام تھا۔ میں اس علاقے میں نو وارد تھا اسلئے مجھے یہاں کے بارے میں جاننے کی ہمیشہ کرید لگی رہتی تھی۔ جرنلسٹ جو ٹھہرا۔ جرنلسٹوں کی یہ فطرت میں ہے کہ وہ ہر کردار میں کوئی نہ کوئی کہانی کھوجنے کی سعی کرتے ہیں۔ اس گاؤں کے زیادہ تر لوگ میری ہی طرح سیدھے سادے تھے اسلئے اُن کی زندگی میں تاک جھانک کرنے میں مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مجھے بس وہی ایک عورت کچھ پر اسرار اور مشتبہ لگتی تھی۔ ایک دن وہ میرے سامنے سے گزری۔ اُسے دیکھ کر میں سہم گیا۔ وہ کسی ڈائن سے کم نہیں لگتی تھی جو نہ جانے کب کس کا کلیجہ نکال کر کھا جائے۔ وہ کو بہ کو، بازار در بازار آوارہ اور بدحالی کے عالم میں گھوما کرتی تھی۔ آشفتہ مو۔ پچکے ہوئے گال۔ پھٹے ہوئے کپڑے۔ اُسکی ہئیت کذائی بتا رہی تھی کہ اُسنے برسوں سے نہایا نہیں ہوگا۔ اُسکے کپڑے اتنے پرانے ہو چکے تھے کہ ان میں لیرے لگے ہوئے تھے۔ وہ ان چیتھڑوں میں ایسے گھوم رہی تھی جیسے وہ زمانہ قدیم کی ایک عورت ہو جس نے ستر پوشی کے لئے چند چیتھڑے پہن رکھے ہوں۔ اُسکے سراپا کا

بغور جائزہ لینے کے بعد میں نے یہ اندازہ لگالیا کہ ایک زمانے میں وہ بہت حسین رہی ہوگی کیونکہ اُسکے خدو خال اس بات کے غماز تھے۔ عورت جب عمر کے ساتھ ساتھ ڈھلنے لگتی ہے یا زندگی سے بیزار ہوجاتی ہے تو وہ اپنا حسن کھودیتی ہے۔ رعنائی اور دلکشی کھونے کے بعد وہ ایک کرم خوردہ کتاب کی طرح لگتی ہے جسکے پنے پھٹے ہوں۔ عبارت غائب ہو۔ اوروں کو وہ کیسی لگتی تھی یہ میں نہیں جانتا مگر مجھے تو وہ بڑی ڈراونی لگتی تھی۔ جس طرح پھولوں کی کیاری کو زندہ رکھنے کے لئے روز پانی دینا پڑتا ہے اسی طرح حسن کو قائم رکھنے کے لئے کھاد پانی کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ چاہے تیل فلیل ہو یا غازہ پوڈر۔ یہ سب چیزیں طلسم حسن کو بنائے رکھنے کے لئے از حد ضروری ہیں۔

کچھ لوگوں کا ماننا تھا کہ وہ دماغی توازن کھوچکی ہے اسلئے دیوانی ہوکر اسطرح اس بستی میں ماری ماری پھرتی ہے۔ کچھ لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ کسی پیر مرشد کی روح اُسکے جسم میں حلول کرگئی ہے اسلئے وہ اس فقیرانہ چولے میں رہتی ہے۔ غرض جتنے منہ اُتنی باتیں۔ اُسے روحانی ہستی ماننے والوں کی تعداد حالانکہ بہت کم تھی مگر وہ جتنے بھی تھے اُس کا خاص خیال رکھتے تھے۔ بہر حال وہ جو بھی تھی ہم سب کے لئے ایک معمہ بنی ہوئی تھی۔

ایک دن میری سماعت سے ایک سریلی آواز ٹکرائی۔ آواز کیا تھی جیسے شہد میں گندھی ہوئی، بتاشے میں گھلی ہوئی ایک میٹھی اور مدھ بھری آواز۔ میں نے دو ایک لوگوں سے اس آواز کی بابت جاننے کی کوشش کی۔ جواب میں جو مجھے سننے کو ملا اُس نے میرے دماغ کی چولیں ہلا کے رکھ دیں۔ یہ آواز اُسی پگلی کی تھی جسے دیکھ کر ہی وحشت ہونے لگتی تھی۔ ایسی ڈراونی عورت اتنی سریلی کیسے ہوسکتی ہے۔ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ پر سچ تو یہی تھا کہ یہ آواز اُسی کی تھی۔ اُسکی آواز میں جادو تھا۔ وہ جب سر لگاتی تھی تو اُسکی آواز پر بڑھتے قدم رک جاتے تھے۔ بہتی ہوائیں تھم جاتی تھیں۔ قل قل کرتی ندیاں جھومنے لگتی تھیں۔ اُسکی آواز میں بلا کا سوز تھا۔ دراصل یہ اُسکے نوحے تھے جو گیت بن کر اُسکے گلے سے نکلتے تھے۔ اُسکی آواز سے ماحول پر وجد کی سی کیفیت طاری ہوجاتی تھی۔ چرندے پرندے تک اُسکی آواز سن کر دوڑتے ہوئے چلے آتے تھے۔ یہی وہ خاصیت تھی جس نے اُسکو سب کا محبوب بنا دیا

تھا۔ میرے لئے تو اُسکی شخصیت کا یہ تضاد اُسے میرے لئے پُراسرار اور پیچیدہ بناتا جارہا تھا۔

میرے اندر اُسکے ماضی کے بارے میں جانکاری حاصل کرنے کے تجسس اور اشتیاق کو دوچند کردیا۔ میں نے اُسکے پس منظر کو جاننے کے لئے کافی چھان پھٹک کی مگر میرے ہاتھ مایوسی کے سوا کچھ نہیں لگا۔ گاوں کے باسی اُسکے بارے میں بہت کم جانتے تھے۔ دراصل وہ اس بستی میں ایک دن ایک خودرو جھاڑی کی طرح نہ جانے کہاں سے اُگ آئی تھی۔ کسی کو اُسکے ماضی کے بارے میں جاننے کی نہ ہی کبھی خواہش رہی اور نہ ہی کسی نے جاننے کی سعی کی۔ لوگ فقط اتنا ہی جانتے تھے کہ بسنت کی ایک صبح وہ ایک پیڑ کے کنج کے پاس بیٹھی تھی۔ بس اُس دن سے وہ یہیں کی ہو کر رہ گئی تھی۔

میں نے بھی ہار نہیں مانی۔ اُسکی زندگی کو ٹٹولنے کی للک مجھے اس بات کے لئے اُکساتی رہی کہ میں اس عورت کے بارے میں سب کچھ جان لوں کیونکہ وہ کوئی معمولی عورت نہ تھی۔ اُسکے سینے میں ایک تاریخ دفن تھی۔ اُسکی آنکھوں میں درد و غم کا ایک اتھاہ ساگر چھپا تھا۔ وہ یا تو خانگی حالات کا شکار تھی یا وہ وقت کی ستائی ہوئی ایک ستم رسیدہ عورت تھی۔ اس سے پہلے میرے دل میں اُس عورت کے لئے نفرت اور کراہت کے سوا کچھ نہ تھا مگر اب اُسی عورت کیلئے میرے دل میں ہمدردی کے سوتے اُبلنے لگے تھے۔ میں اُسکے درد کی تھاہ تک پہونچ جانا چاہتا تھا اسلئے میں اُس عورت کے پیچھے جھڑ بیری کے کانٹے کی طرح پڑ گیا۔ میں یہ بات بخوبی جانتا تھا کہ اس عورت کی چپ توڑنا کوئی آسان کام نہ تھا مگر میں بھی اس معاملے میں بڑا ڈھیٹ تھا۔ میں نے بھی ٹھان لی تھی کہ میں اس عورت کی چپ توڑ کر ہی رہوں گا۔

ایک دن جب وہ ایک پیڑ کے نیچے ایسے بیٹھی تھی جیسے کسی گہری سوچ میں گم ہو میں اُسکے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر چونکی اور اُٹھ کر جانے لگی۔ میں نے اُسکا راستہ روک کر کہا۔

''کب تک اپنے آپ سے، اپنے ماضی سے بھاگتی پھرو گی۔ یہ ماضی آسانی سے تمہارا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ یہ موت کی آخری سرنگ تک تمہارا پیچھا کرتا رہے گا۔ کچھ دن چین سے جینا چاہتی ہو تو اس کینچلی کو اُتار کے پھینک دو۔ جھٹک دو اپنے ماضی کی ساری کھٹی میٹھی یادیں۔ وہ یادیں جو آسیب بن کر تمہارا پیچھا کر رہی ہیں۔''

وہ بت بنی کھڑی تھی۔ اُسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ ہنسے یا روئے۔ بھاگے یا ٹھہر جائے۔ وہ مبہوت ہو کے مجھے یک ٹک دیکھتی رہی۔ میں اُس کے اور قریب چلا گیا اور اُسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

''مجھ پر بھروسہ رکھو۔ میں تمہیں تکلیف نہیں پہونچانا چاہتا بلکہ تمہیں ان بیڑیوں سے آزاد ہوتے دیکھنا چاہتا ہوں جو تم نے خود ہی ڈال کے رکھی ہیں۔ توڑ دو ان زنجیروں کو جو تمہیں ہر دم لہولہان کرتی رہتی ہیں۔ توڑ دو اس چپ کو جو تمہیں اندر ہی اندر کھائے جا رہی ہے اور مجھے بتاؤ کہ تم کون ہو۔ اس علاقے میں کیوں اور کیسے آئی ہو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں ان ساری باتوں کو اپنے تک ہی رکھوں گا۔''

وہ اندر ہی اندر کسی مچھلی کی طرح تڑپنے لگی جو تپتی ریت پر آ کے پڑی ہو۔ اُسکے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔ یہ اندرونی کشمکش تھی جس سے وہ دو چار تھی۔ اُسکے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ دھیرے دھیرے کمزور پڑتی جا رہی ہے۔ وہ جا کر پھر سے چنار کے کنج میں جا کر بیٹھ گئی اور اپنے ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ بہت دیر تک وہ سسکتی رہی۔ پھر اُسنے اپنے آنسو پونچھے اور میری طرف دیکھ کر بولی۔

''کیا جاننا چاہتے ہو تم میرے بارے میں؟''

''سب کچھ۔ تم کون ہو، کہاں سے آئی ہو۔ اس حال میں کیوں ہو۔ کسی سے اپنے دکھ کیوں نہیں بانٹتی ہو۔ اس طرح رات دن گلی گلی کیوں بھٹکتی رہتی ہو؟''

وہ ایک بار خاموش ہو گئی اور اپنی آنکھیں بند کر کے شاید اپنے ماضی کو یاد کرنے لگی۔ آخر ایک طویل خاموشی کے بعد وہ مجھ سے گویا ہوئی۔

''اگر تمہاری یہی ضد ہے تو سنو۔ میں آج برسوں بعد اپنے لب کھول رہی ہوں۔ میرا نام نرگس ہے۔ میرے باپ کا نام فقیر محمد تھا۔ ہم لوگ اوڑی کے کوہستانی علاقے کی ایک پہاڑی پر رہتے تھے جہاں ہمارا ڈھوکا تھا۔ ہم لوگ پیشے سے بکروال تھے۔ بکروالوں کو اُٹھاو چولھا کہتے ہیں کیونکہ وہ ایک

جگہ ٹک کر نہیں رہتے ہیں مگر ہمارا باپ اکثر بیمار رہتا تھا اسلئے ہم نے اوڑی میں ہی بسنے کا فیصلہ کیا۔ ہم چار بھائی بہن تھے۔ ان سب میں میں بڑی تھی۔ ہماری ماں کا چند برس پہلے انتقال ہو چکا تھا اسلئے گھر کی ساری ذمہ داریاں میرے کاندھوں پر آن پڑی تھیں۔ ایک دن جب میں اپنا گلا لے کر جنگل کی طرف جا رہی تھی تو میں بہرام ٹنڈے سے ٹکرائی۔ بہرام ٹنڈا پرلے درجے کا بدمعاش تھا۔ وہ بکروالوں سے تاوان وصول کرتا تھا۔ جو دینے سے انکار کرتا تھا، وہ اُس کی مار پیٹ کر دیتا تھا۔ اس بستی کے لوگ اُس سے خائف رہتے تھے کیونکہ اُسکا ایک رشتہ دار پولیس افسر تھا۔ اسلئے کوئی اُسکے خلاف شکایت بھی درج نہیں کرا سکتا تھا۔ کتنے سارے غریب بکروالوں کے ڈھوکے اُس نے پھونک ڈالے۔ کتنی ساری مویشیاں وہ اُٹھا کر لے گیا تھا۔ یہاں قانون کا نہیں بہرام ٹنڈے کا راج چلتا تھا۔ بات بات پر وہ چاقو چھری لے کر دوڑتا تھا۔ میں نے اُسکے بارے میں کئی بھائی بندوں سے سنا تھا مگر اُس سے کبھی روبرو نہیں ہوئی تھی۔ جب میں نے پہلی بار اُسے دیکھا تو میں سر سے پاؤں تک لرز کے رہ گئی۔ اُسکی صورت بڑی ڈراونی تھی۔ اُسکا رنگ کالا تھا، جسم بے ڈول، ناک چپٹی، ہاتھی جیسے کان اور گھنیری مونچھیں جن پر وہ بار بار تاو دیتا رہتا تھا۔ اُسکا بائیں ہاتھ ٹنڈا تھا اسلئے وہ بہرام ٹنڈے کا نام سے مشہور تھا۔ میرے ساتھ ستم یہ تھا کہ ایک تو میں کنواری تھی اوپر سے بہت خوبصورت تھی۔ بستی کے بہت سارے لونڈے جو ہمارے اُورے دھورے رہتے تھے اُن میں سے کئی ایک مجھ پر مرتے تھے۔ میں تھی کہ ان میں سے کسی ایک کو گھاس بھی نہیں ڈالتی تھی۔ چاند میں داغ ہوسکتا ہے مگر میرے کردار میں ایک بھی داغ نہ تھا۔ میں تو بس اپنے خاندان کی خدمت میں ایسی مگن تھی کہ میرے دل میں اور کوئی جذبہ پنپ ہی نہیں پایا۔ پیار و محبت میرے لئے کسی گناہ سے کم نہ تھا۔ میں تو بس اپنے گھر کی چار دیواری کی اسیر تھی۔ کبھی کبھی جب میرے بھائی بہن کہیں لکڑیاں چننے نکل جاتے تو میں اپنا گلا لے کر پاس ہی کے جنگل تک جاتی اور پھر اپنے چھوٹے بھائی کے آنے تک وہاں رکتی اور پھر اُسکے آتے ہی گھر لوٹ آتی۔ اُس دن بھی میں گلا لے کر جو نکلی تو اُس خبیث سے میرا سامنا ہوا۔ اُسنے مجھے جن ہوس بھر نگاہوں سے دیکھا مجھے ایسا لگا جیسے اُس کی ناپاک نظریں میرے جسم کو چیر کر نکل گئیں۔ میں وہاں سے فوراً آگے بڑھی۔ وہ کچھ دیر وہیں رکا پھر تیز تیز ڈگ بھرتا ہوا وہ وہاں سے چلا گیا۔ جب تک وہ گیا نہیں میرا کلیجہ

دھونکنی کی طرح چلتا رہا۔ جب وہ چلا گیا تو میں نے راحت کی سانس لی۔

میرا باپ میری شادی کسی اچھے اور شریف گھرانے میں کرنا چاہتا تھا۔ کئی رشتے آئے پر بیچ میں کوئی نہ کوئی اڑچن آگئی کہ بات بن نہیں پائی۔ میرے باپ نے ہمت نہیں ہاری۔ اسنے کئی جگہ میرے رشتے کی بات چلائی تھی۔ ایک دن کیا ہوا کہ بہرام ٹنڈا اچانک میرے باپ کے سامنے نمودار ہوا۔ ابو نے جب اُسے دیکھا تو اُسکے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ اُسے لگا جیسے سانپ چوہے کے بل میں گھس آیا ہو۔ اس سے پہلے کہ ابو کچھ پوچھتے وہ بڑے اطمینان اور بے خوفی سے ابو سے مخاطب ہو کے بولا۔

''او فقیرا۔ آج پہلی بار میں نے تیری لونڈیا کو دیکھا ہے۔ کیا مکھن جیسی لونڈیا تو نے پال کے رکھی ہے۔ مجھے تیری یہ لونڈیا بھا گئی ہے۔ میں اس سے نکاح کرنا چاہتا ہوں۔ ایکبار اسکا نکاح میرے ساتھ ہو گیا نا، تیرا سارا دلدر دور ہو جائے گا۔ بول مہر میں کتنے مال مویشی چاہیے۔ کل ہی تیرے کوٹھے پر چھوڑ کے آوں گا''

میرا باپ غریب سہی پر بڑا غیرت مند تھا۔ اُسنے جلبلا کر بہرام ٹنڈے سے کہا۔

''تیرے ساتھ نکاح تو دور میں اپنی بیٹی پر تمہاری منحوس پرچھائی بھی پڑھنے نہیں دوں گا۔ وہ بھلے ساری زندگی کنواری پڑی رہے مگر تجھ جیسے غنڈہ موالی کو میں اپنا داماد کبھی نہیں بناوں گا۔''

میرے باپ کے اس جواب سے بہرام ٹنڈے کی مونچھوں سے چنگاریاں پھوٹنے لگیں۔ وہ تہدیدی انداز میں بولا۔

''فقیرے لگتا ہے تیرے برے دن آگئے ہیں۔ تو نہیں جانتا کہ تو نے کس کے ساتھ دشمنی مول لی ہے۔ میں وہ بلا ہوں جو جس کے پیچھے پڑ جائے وہ یا تو میرے قدموں میں گرتا ہے یا دنیا چھوڑ کے چلا جاتا ہے۔ آج سے سمجھ لے کہ تمہاری بربادی کے دن شروع ہو گئے ہیں۔ قسم کھا کے کہتا ہوں کہ میں تمہارا وہ حشر کر دوں گا کہ تمہارے لئے ایک ایک پل جینا دشوار ہو جائے گا۔ تم نہ چین سے جی سکو گے نہ آرام سے مر سکو گے''

وہ ہمیں دھمکی دیکر چلا گیا۔ ہم سب سہم کر رہ گئے۔ ابو لرزہ براندام ہو کر رہ گیا۔ وہ جانتا

تھا کہ بہرام ٹنڈہ بڑا کمینہ اور موذی آدمی ہے۔ وہ اُنہیں زک پہونچائے بنا رہے گا نہیں۔ اسلئے اُس نے چاہا کہ جتنی جلد ہوسکے وہ میرے ہاتھ پیلے کردے تا کہ بہرام ٹنڈے کے قہر سے میں بچ جاوں اور وہ بس ہاتھ ملتا رہ جائے۔ ابو نے جہاں جہاں میرا رشتہ پکا کر دیا، بہرام ٹنڈا جا کر اُنہیں دھمکاتا تھا اور وہ اگلے روز رشتہ توڑ دیتے تھے۔ اُسنے سچ مچ ہماری زندگی اجیرن کر کے رکھ دی تھی۔ ابو اندر ہی اندر فکر و تشویش سے گھلے جا رہے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں اس کمینے کے ہتھے چڑھ جاوں اسلئے وہ مجھے کسی نہ کسی طرح ٹھکانے لگانا چاہتے تھے۔

ایک دن کیا ہوا کہ ابو میرے رشتے کے سلسلے میں دوسری بستی میں چلے گئے تھے۔ میرے بھائی بہن گلا لے کر جنگل میں تھے۔ میں گھر پر اکیلی تھی۔ بہرام ٹنڈہ جیسے اسی موقع کی تاک میں تھا۔ وہ پچھواڑے سے کوٹھے میں گھس گیا۔ جب وہ میرے سامنے آ کے کھڑا ہو گیا تو میرے پاوں تلے کی زمین کھسک گئی۔ مجھے لگا جیسے میرے سامنے ملک الموت آ کے کھڑا ہو گیا ہو۔ میں حاس باختہ ہو کر ادھر اُدھر بھاگنے کی کوشش کرنے لگی مگر اُس نے مجھے پکڑ کر نیچے گرا دیا۔ میں نے اُسکے چنگل سے آزاد ہونے کے لئے بڑے ہاتھ پاوں مارے مگر وہ تو مجھ پر شیر کی طرح سوار تھا۔ اُسنے میری عزت و عصمت کو تار تار کر کے رکھ دیا۔ میری عصمت لوٹ کر وہ ایک فاتح کی طرح اُٹھا اور بڑی بے نیازی کے ساتھ کوٹھے سے نکل گیا۔ ایک پل میں میری دنیا لٹ چکی تھی۔ ایک پل میں میرا سب کچھ تباہ و برباد ہو کے رہ گیا تھا۔ اُسنے میرے جسم کو ہی داغدار نہیں میری روح کو بھی تار تار کر دیا تھا۔ ابو جب گھر لوٹا اور اُسنے مجھے لٹی پٹی حالت میں دیکھا تو اُس کے اوسان خطا ہو گئے۔ میں ابو کو دیکھ کر دہاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ جب ابو نے میرے آنسو پونچھے تو میں نے اُنہیں سارا واقعہ سنایا۔ اُنکے سر پر گویا آسمان ٹوٹ پڑا۔ وہ ٹھسے سے نیچے بیٹھ گئے اور پھر اپنا سر پیٹ کر رونے لگے۔

میں اب کسی کے لائق نہیں رہی تھی۔ کہتے ہیں آبرو موتی کی آب ہوتی ہے۔ میری عصمت میں داغ لگ چکا تھا۔ اب مجھے کون اپناتا۔ یا تو مجھے ساری زندگی یونہی کنواری بن کر اس داغ کے ساتھ جینا تھا یا مجھے بہرام ٹنڈے کی داشتہ بن کر رہنا تھا۔ ابو نے بہت سوچا۔ اُسے کوئی راہ سجھائی نہیں

دیر ہی تھی سوائے اسکے کہ وہ بہرام ٹنڈے کے آگے گر کر اُسے منالے اور مجھے اُسکی امان میں دے دے۔
ابو کو مجبوراً وہی کرنا پڑا۔ وہ بہرام ٹنڈے کے قدموں میں گرا اور اُسے اس بات کے لئے آمادہ کرلیا کہ وہ میرے ساتھ نکاح کرلے۔ بہرام ٹنڈے نے ایک فاتح کی طرح ابو پر چوٹ کرتے ہوئے کہا۔

''کیوں وہ تمہاری اکڑفوں کہاں گئی۔ تم تو میری منحوس چھایا بھی اپنی بیٹی پر پڑنے دینا نہیں چاہتے تھے اب اُسے مجھے کیوں سونپ رہے ہو؟ فقیرا شاید تم یہ محاورہ بھول گئے تھے کہ جب پانی میں رہنا ہو تو مگرمچھ سے بیر رکھا نہیں جاتا۔ اب بیر رکھ کے کیا پالیا تم نے۔ زلت اور بدنامی۔ اب تیری بیٹی کو میرے سوائے کوئی نہیں اپنائے گا کیونکہ وہ داغدر ہو چکی ہے۔ تم بڑے اور ظعیف نہ ہوتے تو میں تمہیں اُس دن کی بے عزتی کا مزید مزہ چکھاتا مگر مجھے تمہاری لاچارگی پر ترس آرہا ہے۔ اسلئے میں تمہاری بیٹی نرگس کو اپنی امان میں لینے کے لئے تیار ہوں۔''

وہ جیت گیا۔ ہم ہار گئے۔ اُسنے دھوکے اور فریب سے مجھے حاصل کیا تھا۔ اُسنے میری عزت وعفت پر داغ لگا کے جو زخم مجھے دئے تھے اُنکی کسک اور تپک سے میں تڑپنے اور تلملانے لگتی تھی۔ مجھے اپنے جسم سے نفرت ہونے لگی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے میرے بدن پر پھوڑے اور پھنسیاں نکل آئے ہوں۔ میں اُسے دیکھتی تھی تو میرا ارم رم کراہ اُٹھتا تھا۔ یہ کتنی بڑی ستم ظریفی تھی کہ جو میرا قاتل تھا وہی میرا منصف بنا ہوا تھا۔ میں رات دن درد کے انگاروں پر جلتی رہتی تھی۔ میرے دل میں انتقام کے شعلے دہک رہے تھے۔ بدلے کی آگ سلگ رہی تھی۔ میں اس آدمی سے بدلہ لینا چاہتی تھی جسنے میرے پاکیزہ بدن کو نجس اور ناپاک کردیا تھا۔ مگر وہ اتنا طاقتور اور توانا تھا کہ میں اُسکا بال بھی بیکا نہیں کرسکتی تھی۔

وہ مجھے رات بھر بھنبھوڑ کے رکھ دیتا تھا۔ ایک گدھ کی طرح مجھے نوچتا کھسوٹتا رہتا تھا۔
کہنے کو تو یہ میرا مجازی خدا تھا مگر میں اسے اپنا قاتل مانتی تھی۔ اُسنے میری عزت ہی نہیں لوٹی تھی میرے سارے ارمان ذبح کئے تھے۔ میری آرزوں اور اُمیدوں کا خون کرڈالا تھا۔ میں اس آدمی سے بدلہ لینے کی درپے تھی مگر وہ اجگر تھا ایسے میں میں اس آدمی سے کیا بدلہ لے پاتی۔

وہ کہتے ہیں نا کہ دبے پہ چیونٹی بھی کاٹ کھاتی ہے۔ میں بھی اسے سبق سکھانا چاہتی

تھی۔ میں جنگلوں کی پروردہ تھی۔ میں بچھو اور سانپ بے خوفی سے پکڑ لیتی تھی۔ ایک دن میں نے کیا کیا کہ میں ایک زہریلا سانپ پکڑ کر لے آئی اور اُسے ایک تھیلی میں چھپا کے رکھ دیا۔ جب وہ رات کو سو گیا تو میں سو نہیں پائی، آدھی رات تک جاگتی رہی۔ جب مجھے پوری طرح یہ اطمینان ہو گیا کہ وہ بے سدھ ہو کے پڑا ہے تو میں چپکے سے اُٹھی، دبے پاوں سے دوسرے کمرے میں گئی، وہاں سے اُس زہریلے سانپ کو اُٹھا کر لے آئی اور پھر اس سانپ کو اُسکے بغل میں ڈال دیا۔ جونہی اُسنے کروٹ بدلی تو سانپ نے اُسے ڈس لیا۔ وہ ایک چیخ مار کے اُٹھ بیٹھا۔ میں نے تجاہل عارفانہ سے پوچھا۔

''کیا ہوا کوئی ڈراوانا خواب دیکھ لیا کیا؟''

''مجھے کسی نے کاٹ لیا۔''

''کس نے؟ ذرا بستر پر ہاتھ پھیر کے تو دیکھو۔''

ایک بار پھر اُسکا ہاتھ سانپ پر پڑ گیا اور اُسنے اُسے دوسری بار ڈس لیا۔ وہ تڑپنے لگا۔ منہ سے جھاگ آنے لگا۔ اب میں ایک فاتح کی طرح کھڑی تھی اور وہ دہائی دے رہا تھا۔

''مجھے بچا لو نرگس۔ مجھے بچا لو''

''کمینے جب میں تمہارے سامنے روئی گڑگڑائی تھی تب تو نے مجھ پر ترس کھایا تھا کیا؟۔ میں تمہیں کیوں بچاوں جب میں نے ہی تمہیں سانپ سے ڈسوالیا ہے میں تم سے بدلہ لینا چاہتی تھی۔ سو آج میرا بدلہ پورا ہوا۔ اب تم ایڑیاں رگڑ رگڑ کے مر جاوگے اور میں تمہیں مرتے دیکھ لوں گی۔ تمہیں مرتے دیکھ کر بڑا مزہ آئے گا مجھے کیونکہ میں مہینوں سے اندر ہی اندر جلتی رہی ہوں، سلگتی رہی ہوں۔''

تھوڑی دیر تک وہ ایڑیاں رگڑتا رہا اور پھر اُسکا دم نکل گیا۔ جب مجھے پوری طرح سے اطمینان ہوا کہ یہ خبیث مر چکا ہے تو میں باہر آ کر واویلا کرنے لگی۔ لوگ میری چیخ و پکار سن کر جمع ہو گئے۔ میں اُنہیں اندر لے گئی جہاں وہ مردہ پڑا تھا اور اُسکے بغل میں ایک پھنکارتا ہوا سانپ کھڑا تھا۔ کئی لوگوں نے بڑی مشقت کے بعد سانپ کو قابو میں کر لیا اور پھر اُسکی لاش باہر نکال لائے۔ اُسکی تجہیز و تکفین

کی۔آٹھ دس دن میں اُسکا سوگ مناتی رہی پھر میں کسی سے کچھ کہے بنا بستی چھوڑ کر چلی گئی اور بھٹکتے بھٹکتے یہاں پہونچ گئی۔ میں ایک قاتل بھی تھی اور مقتول بھی، یہ احساس مجھے کچو کے مارتا رہتا تھا کہ میں نے ایک انسان کا مار ڈالا تھا مگر ساتھ ہی یہ خیال میری روح کو فرحت اور طمانیت بخشتا تھا کہ جس نے میرے پاکیزہ بدن کو داغدار کر دیا میں نے اُس سے بدلہ لیا۔ مگر میرا ضمیر مجھے لعنت ملامت کرتا رہا۔ میرا گناہ آسیب بن کر میرا پیچھا کرتا رہا۔ میں قانون کی نظر میں گناہ گار نہ تھی مگر ضمیر کی عدالت نے مجھے گناہ گار ٹھہرایا تھا۔ اپنے دل کے درد کو بیان کرنے کے لئے میں نالہ وفریاد کرتی تھی۔ اس سے میرا جی ہلکا ہو جاتا تھا۔ رہ رہ کے مجھے بس یہی غم اندر ہی اندر کھاتا رہتا تھا کہ میں نے جو کچھ کیا اچھا نہیں کیا کیونکہ سزا اور جزا دینے والی میں نہیں بلکہ اوپر بیٹھا خدا ہے جو سب کچھ دیکھتا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ جو کچھ میں نے کیا کیا وہ صحیح تھا یا غلط؟''

میری آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ اپنے آپ کو گناہ گار ٹھہرا رہی تھی اور انہی گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لئے وہ ماری ماری پھر رہی تھی مگر سچ تو یہ تھا کہ گناہ گار نرگس نہیں، گناہ گار ہم سب ہیں۔ ہمارا یہ سماج ہے جو بہرام ٹنڈے جیسے بے رحموں کی آبیاری کرتا ہے۔ جو نرگس جیسے بے داغ پھولوں کو روندتا ہے۔ مسلتا ہے۔ میں نے نرگس کے ہاتھوں کو چوما اور پھر اُس سے نظریں ملائے بنا وہاں سے یوں چل پڑا جیسے بہرام ٹنڈے کے گناہوں میں میں بھی شامل تھا۔



شرارے

آفتاب کی پہلی کرن نے جونہی کھلن مرگ کی پہاڑی کا بوسہ لیا تو حاکم دین اپنی کوٹھی سے باہر نکلا۔اصطبل میں کھڑی گھوڑی پر زین ڈالا اور پھر اس پر سوار ہو کر جب اُسنے اُسے مہمیز کیا تو وہ کھلن مرگ کی طرف جانے والی پگڈنڈیوں پر بگ ٹٹ دوڑنے لگی۔سفید براق جیسی اس گھوڑی کو حاکم دین نے حرز جان بنا کے رکھا تھا۔یہ گھوڑی اُسے اپنی جان سے بھی زیادہ پیاری تھی۔گھوڑی بھی مالک کی بڑی وفادار تھی۔حاکم دین کو چھوڑ کے وہ کسی اور کو اپنے پٹھے پر ہاتھ تک رکھنے نہیں دیتی تھی۔وہ اُسکے ہر اشارے کو سمجھتی تھی۔گھوڑی جب جنگل کی اس اوبڑ کھابڑ پگڈنڈی پر دوڑنے لگی تو اُس کے کھروں کی ٹاپیں جنگل کے سینے پر ایسے پڑنے لگیں جیسے اس سنسان جنگل میں کسی حملہ آور نے جنگ کا نقارہ بجا دیا ہو۔جنگل کی چھاتی پر پڑنے والے گھوڑی کے سموں کی مار سے پورا جنگل تھرا اُٹھا۔چرندے پرندے ڈر کے مارے ادھر اُدھر بھاگنے لگے۔دائیں بائیں جتنے بھی کوٹھار تھے اُن میں رہنے والوں کے چہرے فق ہونے لگے۔عورتیں بلوں میں جا کر چھپ گئیں۔مردم سادھے کھڑے رہے۔حاکم دین کی اس علاقے میں ایسی دہشت اور دبدبہ تھا کہ پرندہ بھی اس علاقے میں اُسکی اجازت کے بنا پر نہیں مار سکتا تھا۔وہ صیح معنوں میں اس علاقے کا بے تاج بادشاہ تھا۔اس علاقے میں رہنے والے گوجر اُسے اپنا چودھری مانتے تھے اور اُسکا ہر حکم، حکم الٰہی کی طرح ہوتا تھا۔اُسکی ہر بات پتھر کی لکیر ہوا کرتی تھی۔ابھی تک کوئی مائی کا لال اس علاقے میں ایسا پیدا نہیں ہوا تھا جو حاکم دین کی حکم عدولی کر سکے۔اس بستی میں جب بھی کوئی جھگڑا اٹنٹا ہوتا یا کوئی

قضیہ کھڑا ہو جاتا تو نپٹانے کا اختیار صرف اُس کو تھا۔ اُس کا جو بھی فیصلہ ہوتا تھا وہ دونوں دھڑوں کو بسر چشم قبول کرنا پڑتا تھا۔ اُسکی کوٹھی میں ہر ہفتے عدالت لگتی تھی جس کا وہ خود ہی منصف تھا اور خود ہی جلاد۔ یہاں جو کچھ بھی ہوتا تھا اسکی خبر سرکار کے فرشتوں کو بھی نہیں لگتی تھی۔

حاکم دین نے اپنی یہ سلطنت گل مرگ کے مضافات میں پھیلی ہوئی ان پہاڑیوں پر قائم کی تھی۔ گل مرگ کے چاروں اور پہاڑیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ نظر آتا تھا اور ان پہاڑیوں کے بیچ گل مرگ کی وادی کسی زمردی کٹورے کی طرح لگتی تھی جسکے گرد دیودار اور چیڑھ کے پیڑ ایسے کھڑے نظر آتے تھے جیسے ہزاروں سنتری محافظ بن کے کھڑے ہوں۔ گل مرگ سے لے کے کھلن مرگ تک یہ پہاڑ زندگیوں کی رعنائیوں سے بھرپور تھے۔ سرمئی رنگ کے یہ پہاڑ سرسبز و شاداب جنگلوں کے ساتھ یوں کھڑے دکھائی دیتے تھے جیسے بہت ساری مائیں اپنے اپنے بچوں کو بانہوں میں لئے بیٹھی ہیں۔ کئی ایک پہاڑ ایسے بھی تھے جو سر پر برف کی کلغی سجائے، یوں کھڑے نظر آتے تھے جیسے آسمان سے محو گفتگو ہوں۔ کبھی کبھی جب موسم کا مزاج بگڑ جاتا تھا تو بادل کے ٹکڑے ان پہاڑوں پر ایسے لہرانے لگتے تھے جیسے آکاش سے اُتری پریاں اپنے اپنے سفید آنچل لہراتے ہوئے رقص و سرود میں ڈوبی ہوں۔ بسنت کے دن ہوں یا جاڑے کا موسم یہاں یخ بستہ ہوائیں ہر دم چلتی رہتی تھیں۔ ان ہی دیو قامت پہاڑوں کے بیچوں بیچ اُن گوجروں کے کوٹھار آباد تھے جنہوں نے برسا برس سے ان ہی جنگلوں میں بود و باش اختیار کی تھی۔ یہ لوگ باہر کی دنیا سے ہر دم کٹے کٹے رہتے تھے۔ یہاں نہ کوئی اسکول تھا نہ کوئی اسپتال۔ یہاں جو کچھ بھی تھا وہ یہ جنگلی پیڑ تھے ہریالی تھی، پہاڑوں کے تھن سے بہتا دودھیا پانی تھا جو آگے جا کر چھوٹی چھوٹی ندیوں کی شکل میں قل قل کرتا ہوا بہتا تھا۔ تر و تازہ اور مست و مدہوش کرنے والی ہوائیں تھیں جو یہاں کے رہنے والوں کو بے پناہ قوت و توانائی بخش دیتی تھی۔ یہاں کے لوگ بہت کم بیمار پڑتے تھے۔ اگر خدانخواستہ کبھی بیمار پڑے بھی تو اُنہیں کسی ڈاکٹر کے پاس بھاگنا نہیں پڑتا تھا بلکہ وہ اسی جنگل سے اپنی دوا پا لیتے تھے۔ یہاں جڑی بوٹیوں کا ایک خزانہ چھپا تھا۔ ان جڑی بوٹیوں کی پہچان انہی لوگوں کو تھی جو یہاں رہتے تھے۔ اُنہوں نے اپنے ہر مرض کا علاج ان ہی جڑی بوٹیوں میں پا لیا تھا اور وہ ان ہی کے سہارے تمام تر

مہلک بیماریوں سے محفوظ رہتے تھے۔

اس علاقے کے تمام گوجر مال مویشیاں پالتے تھے۔یہی اُن کا زریعہ معاش تھا۔گل مرگ میں دودھ مکھن اور گھی کی کافی مانگ تھی۔اسکے علاوہ وہ یہاں کے تمام ہوٹلوں کو یہی لوگ گوشت بھی مہیا کرتے تھے۔ہر گوجر کے پاس اپنا ایک گلہ ہوتا تھا۔گائے بھینس کے علاوہ یہ لوگ بھیڑ بکریاں بھی پالتے تھے۔ڈھور ڈنگر کو پالنے میں اُنہیں زیادہ مشقت نہیں کرنی پڑتی تھی۔صبح صبح ڈنگروں کو وہ آ کھر سے نکال کر باہر چرنے کیلیئے چھوڑ دیتے تھے۔ہر اور تو ہریالی ہی ہریالی تھی اسلیئے وہ شام تک چرتے رہتے تھے اور شام کو یہ انہیں واپس باندی خانے میں ڈال دیتے تھے۔یہاں کے گھاس میں اتنی قوت تھی کہ ایک ایک بھینس صبح شام دس پندرہ کلو دودھ دے جاتی تھی۔اپنے تحفظ کے لئے اُنہیں حاکم دین کی چوکھٹ پر ہر سال نذرانہ چڑھانا پڑتا تھا۔یہ ایک طرح کا تاوان تھا جسے یہاں کے لوگوں نے نیاز و نذر کا نام دیا تھا۔حاکم دین اس علاقے کا صاحب جائیداد ہی نہیں بلکہ صاحب ثروت بھی تھا۔وہ خود کچھ کرتا دھرتا نہیں تھا۔ڈھور ڈنگر پالنے کے لئے اہالی موالی رکھے تھے۔گائے بھینس کو کے لئے دو دو بیگمیں تھیں جو آپ ہی بی بی اور آپ ہی باندی تھیں۔حاکم دین تو بس حکم چلانے کا عادی تھا۔کام دام سے اُسے کوئی مطلب نہیں تھا۔

حاکم دین بڑا رنگین مزاج، پر وضع اور شوخ طبع آدمی تھا۔ساٹھے پاٹھے کا ہو کے بھی وہ گبرو جوان لگتا تھا۔وہ جب بھی گھر سے نکلتا تھا تو سر پر طرہ باندھ کر وہ پورے طنطنے کے ساتھ باہر نکلتا تھا۔اُسکی شان بان کا اندازہ اس بات سے ہی لگایا جاسکتا تھا کہ وہ خود گھوڑی پہ سوار ہوتا تھا اور پیچھے گھر کے دو چار لونڈے یا کارندے گھوڑی کے پیچھے کتوں کی طرح بھاگتے رہتے۔ویسے وہ گھر سے بہت کم نکلتا تھا لیکن جب بھی نکلتا تھا اپنے ساتھ کوئی نہ کوئی آفت لے کے ہی نکلتا تھا۔اُس دن بھی جب وہ سویرے سویرے گھر سے نکلا تو آس پاس کے گوجر سمجھ گئے کہ کہیں آفت پڑنے والی ہے۔وہ جدھر سے گزرتا وہاں کے مکین تب تک دم سادھے کھڑے رہتے جب تک وہ آگے نہیں بڑھتا تھا۔اُسکے جاتے ہی وہ راحت کی سانس لیتے تھے۔وہ جوں جوں آگے بڑھتا چلا گیا بستی کے گوجروں کا تجسس اور اضطراب بڑھتا چلا گیا۔وہ پیڑوں کے پیچھے چھپ کر چودھری کی سمت کا جائزہ لیتے رہے۔چودھری چلتے چلتے اللہ بخش گوجر کے کوٹھے

کے پاس رک گیا۔ اللہ بخش گوجر پر حال ہی میں اُفتاد پڑی تھی۔ اُسکے کوٹھے کے بالکل سامنے بجلی گری تھی۔ وہ اور اُسکی بیٹی بال بال بچ گئے پر اُسکی بیوی اور اُسکا مال جل کر راکھ ہو گئے۔ چودھری حاکم دین اللہ بخش کو اُسی سلسلے میں پرسا دینے آیا تھا۔

جب اللہ بخش نے چودھری کو اپنے کوٹھے کی جانب بڑھتے دیکھا تو وہ پہلے بھونچکا رہ گیا پھر سرعت سے اُٹھ کھڑا ہوا اور چودھری کی طرف تیزی سے بڑھا۔ وہ اُسکے ہاتھوں کا بوسہ لینے لگا۔ چودھری نے گھوڑی کو کھونٹے سے باندھ لیا اور پھر اللہ بخش کے کاندھے پر جو ہاتھ رکھا تو اللہ بخش اپنے جذبات کو دبا نہ سکا اور وہ بچے کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔

''سب مکی گئیو چودھری۔ سب مکی ہو گیا۔ زنانی گئی، سارو ڈنگر گئے۔ بس نیستی کے مارے ہم دو بچے۔ ایک میں ایک مہاری بیٹی ماہ جبین۔''

''سب جانتا ہوں۔ سب جانتا ہوں۔'' وہ اُسکے سر پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ ''یہ مرنا جینا تو دنیا میں لگا ہی رہے گو۔ اسی کو لے کے بیٹھو گے تو پھر آگے کا کب سوچو گے۔''

''چودھری اس حادثو سے تو میں اپنی سدھ بدھ ہی بھلا بیٹھو ہوں۔ تھارے سے کے چھپاوں چودھری بڑو تنگی تکلیف ما ہوں۔ سوچتھو اس برس ماہ جبین کے ہاتھ پیلے کر چھڑوں گو پر اس بجلی نے تو سب کچھ اُلٹ پلٹ کے رکھ دیئو۔ اب تو یہ حال ہو گئیو کہ ہم لوگ دانے دانے کے محتاج ہو کے رہ گئے ہو۔''

''ارے تھارے گھر میں تو ہیرے کی کان چھپی ہے تم اپنے آپ کو اتنا محتاج اور لاچار کیوں سمجھتے ہو؟''

''میں کچھ سمجھو نہیں چودھری؟''

''بننے کی کوشش مت کرو۔ تھاری بیٹی کسی ہیرے کی کان سے کم ہے کیا۔ بولو کتنی بھینسیں درکار ہیں۔ آج ہی بجھوا دیتا ہوں۔''

اللہ بخش نے سات گھاٹ کا پانی پیا تھا۔ وہ چودھری کے ارادے کو فوراً بھانپ

گیا۔ چودھری کی نظر اُس کی بیٹی پر تھی اور وہ اُس سے ہمدردی جتانے نہیں آیا تھا بلکہ اُسکی بیٹی کا سودا کرنے آیا تھا۔ وہ بھی بڑا گھاگ تھا۔ فوراً پینترا بدل کے بولا۔

''وہ کیا ہے چودھری کہ کل ہی ایک رشتو آیو تھو ماہ جبین کے واسطے۔ وہ چار بھینسیں، دو گائے اور سات بھیڑ و دینے کے لئے تیار تھو۔ میں نہ مانا۔ ایسی خوبصورت لڑکی بستی میں کوئی دوسری ہے کیا۔ میں نے وہ سودا ٹھکرادیو۔''

چودھری حاکم دین سمجھ گیا کہ بڑھا اللہ بخش ماہر کھلاڑی ہے۔ وہ کوڑی کوس دوڑنے والوں میں سے ہے۔ وہ اتنی آسانی سے ڈھب میں آنے والا نہیں اسلیئے اُس نے چار کی جگہہ پانچ بھینسیں دینے کی پیشکش کی۔ بوڑھا تب بھی نہ مانا۔ آخر تان ٹوٹی چھ بھینسیں پر۔ ساتھ میں دو گائے اور آٹھ بھیڑیں دینے کا بھی چودھری نے وعدہ کیا۔ دونوں نے آپس میں قول وقرار کیا اور چودھری خوشی خوشی لوٹ گیا۔ اُسکے جانے کے بعد جب اللہ بخش نے یہ خوشخبری اپنی بیٹی کو سنائی تو وہ تیورا کے رہ گئی۔ ماہ جبین اتنی حسین وجمیل تھی کہ اُسکی خوبصورتی کے چرچے اس بستی میں ہوتے ہی رہتے تھے۔ ماہ جبین اسی بستی کے ایک گوجر جمیل خان کو دل دے بیٹھی تھی۔ دونوں نے ساتھ جینے اور ساتھ مرنے کے آپس میں قول وقرار بھی کئے تھے۔ ایسے میں یہ خبر سن کے اُسکے پاوں تلے کی زمین سرک گئی اور وہ دیوار سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔

''ابو تم نے مجھ سے پوچھو بنا ہی مارے تقدیر کا فیصلو کردیو۔ کم سے کم ایک بار مجھ سے پوچھ لیو ہوتو۔''

''تھارے سے پوچھ لیتا تو کیا تو حامی بھرتی۔ اس رشتو میں نہ جانے کتنے کھوٹ نکالتی۔ اپنی جان کی خیر منا کہ چودھری تھارے عوض بہت کچھ دے کے جارہے ہو۔ ویسے ہی ضد لے کے بیٹھ جاتو تو کے کرتی تم۔ چودھری سے دشمنی مول لیتی کیا؟ یہ مت بھول کہ جب پانی میں رہنا ہوتو مگرمچھ سے بیر نہیں رکھا جاتو۔ وہ ٹھہرا اس بستی کا چودھری۔ یہاں پتو بھی ہلتا ہوتو اُسکی رضا سے۔ ایسے میں کون اُس سے بیر مول لے۔ کچھ بھی ہو یہ رشتو میں نے سوچ سمجھ کے طے کیو ہو۔ تم چودھری کے گھر چلی جاوگی تو رانی بن کر رہوگی۔ چودھری تنے پلکوں پر بٹھائے گا۔ اتنا تو پکو یقین ہے مجھے۔''

''میں رانی بن کر نہیں بلکہ چودھری کی داشتہ بن کر رہوں گی۔ پہلے سے ہی اُسکے حرم میں دو بیگمیں موجود ہیں۔ کل مارے سے بھی جی بھر جائے گا تو پھر ایک اور کو لے آئے گو۔ پھر ماری حثیت بھی لونڈی باندی جیسی ہو جائے گی۔ ابو تو نے مارے ساتھ بہت بڑا ظلم اور نا انصافی کید وہے۔ سودا کیو ہے مارا۔ کتنو بھی بے غیرت باپ ہوا پنے پوت کا کبھی سودا نہیں کرتو۔ ایک تم ہو جو اپنی بیٹی کے ارمانوں کو روند کر اپنے لئے آسائشیں ڈھونڈ رہے ہو۔ شرم کرو ابو، شرم کرو''

بیٹی کی باتیں اللہ بخش کے دل میں تیر کی طرح لگیں۔ وہ لالچی ضرور تھا پر اتنا بے رحم نہیں تھا کہ اپنی بیٹی کی لاش پر اپنی خوشیوں کا محل کھڑا کر دے۔ وہ بہت دیر تک یوں بیقراری سے پہلو بدلتا رہا جیسے وہ کسی جلتے توے پر بیٹھا ہو۔ اُسے اپنی غلطی کا احساس تو ہو رہا تھا پر اب مسلہ یہ تھا کہ چودھری سے کیسے جان چھڑائی جائے۔ اسمیں شک نہیں کہ اُسکے پاس ایک شاطر دماغ تھا۔ چودھری اُسکے سامنے بے دال کا بودم تھا پر وہ کہتے ہیں نا گانٹھ میں زر ہے تو نر ہے نہیں تو خر ہے۔ چودھری کے پاس زر ہی تو تھا جسکے بوتے پر وہ سب کو اُنگلیوں پر نچاتا تھا۔ ایسے میں اُسکے چنگل سے کیسے چھوٹا جائے۔

اُدھر وہ جمیل خان تھا جسکے پاس سر چھپانے کو چھت بھی مہیا نہ تھی۔ وہ تو لوگوں کے ڈھور ڈنگر چرایا کرتا تھا۔ وہ حسین تھا جمیل تھا، جوان تھا اور محنتی پر ان سب خوبیوں کے باوجود وہ چودھری کا پاسنگ بھی نہیں تھا۔ بے زر عشق ٹیں ٹیں۔ بھوکے پیٹ دل لگانے کی کوئی تک ہی نہیں بنتی پر دل کا کیا کیجئے جو گدھی پر آجائے تو پری بھی اُسکے سامنے ہیچ لگتی ہے۔ ماہ جبین کے چاہنے والوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ وہ چاہتی تو کسی مال دار گوجر کو اپنے دام الفت میں پھنسا سکتی تھی مگر دل آگیا ایسے بھوکے نادار پر جسکے تن پر نہ کپڑا پیٹ میں نہ روٹی۔ اللہ بخش عجب کشمکش میں مبتلا تھا۔ اُس کی حالت اُس سانپ جیسی تھی جسکے منہ میں چھچھوندر ہو جسے نہ وہ اُگل سکے اور نہ نگل سکے۔ دونوں صورت میں اُسی کا نقصان تھا۔ اللہ بخش کئی روز تک اسی تگ و دو میں رہا۔ اُسے کچھ بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

نکاح کی تاریخ قریب آتی جا رہی تھی۔ اللہ بخش کی دھڑکنیں بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔ ماہ جبین تو جیسے سوگ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ نہ منہ سے بولے نہ سر سے کھیلے۔ ایسا لگے جیسے اُسنے چپ شاہ کا روزہ

رکھ لیا ہو۔ کبھی کبھی وہ اس قدر آزردہ اور دل برداشتہ ہوجایا کرتی تھی کہ تنہائی میں بیٹھ کر وہ دہاڑیں مار مار کر رونے لگتی تھی۔ بیٹی کا یہ حال دیکھ کر اللہ بخش اپنا من مسوس کر رہ جاتا تھا۔

آخر وہ دن آ ہی گیا۔ چودھری اپنے دو چار پیادوں کے ساتھ اللہ بخش کے گھر پر نازل ہوا۔ اللہ بخش نے باہر آ کر چودھری کا سواگت کیا اور پھر اُسے بڑے عزت و احترام کے ساتھ اندر لے آیا۔ ماہ جبین رو رو کر ہلکان ہو چکی تھی۔ وہ یہ بات بخوبی جانتی تھی کہ چودھری کے دبدبے کے آگے اُسکی کچھ بھی نہ چلے گی۔ اُسنے اگر چودھری سے دشمنی مول لینے کی کوشش کی تو وہ کہیں کی نہیں رہے گی۔ چودھری اُسکا جینا حرام کر دے گا۔ اُسے چودھری پر کم اپنے باپ پر زیادہ غصہ آ رہا تھا جو اُسکی اس بربادی کا ذمہ دار تھا۔ وہ روتے دھوتے باہر آ گئی جہاں چودھری قاضی کے ساتھ تیار بیٹھا تھا۔ جونہی قاضی نکاح پڑھنے کی تیاری کرنے لگا تبھی کہیں سے کسی شیر خوار بچے کے رونے کی آواز آئی۔ کمرے میں بیٹھے سبھی افراد کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس سے پہلے کہ کوئی اللہ بخش سے اس بچے کے بارے میں پوچھتا وہ باہر جا کر بچے کو اُٹھا کر لے آیا اور اُسے چودھری کی گود میں ڈال کر بڑی بے خوفی سے بولا۔

''چودھری اب جب کہ تم میری بیٹی کو اپنے عقد میں لینے والے ہو میں چاہتا ہوں کہ تم اس بچے کو بھی اپنا لو جسے ماہ جبین نے جنم دیا ہے۔''

اس انکشاف سے چودھری ایسے اُچھلا جیسے اُسکی گود میں بچہ نہیں بلکہ کوئی زہریلا سانپ آ گرا ہو۔ وہ بچے کو ایک طرف پھینک کر نفرین بھرے لہجے میں چلایا۔

''تمہاری بیٹی ایک ناجائز بچے کی ماں بھی بن چکی ہے، یہ بات تم نے مجھ سے چھپا کے کیوں رکھی؟''

''یہ بچہ ناجائز نہیں ہے چودھری۔ یہ بچہ شرعاً و عرفاً اُتنا ہی جائز ہے جتنے آپ سب کے بچے۔ یہ بچہ جمیل خان کا ہے جس نے ماہ جبین سے نکاح کیے۔ گو کہ اس شادی میں میری رضا شامل نہ تھی مگر اُس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ نکاح تو ہوئے نا۔ جب تم نے اس سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کی تو میں نے سوچا کہ تم ضدی آدمی ہو۔ اپنی ضد نہیں چھوڑو گیا سلیئے میں نے اسے جمیل خان سے اسے طلاق

دلوایا۔اب کوئی اڑچن نہیں ہے۔تم اسے اب اپنے نکاح میں لے سکتے ہو۔''

چودھری اللہ بخش کا چہرہ غصے سے تمتما اُٹھا۔اُسنے غضب ناک ہوکر اللہ بخش کی طرف دیکھا اور پھر چلا کر بولا۔

''اللہ بخش! میں گوشت خور ضرور ہوں مگر میں کسی کا جھوٹا نہیں کھاتا۔میں تو سمجھ رہا تھا کہ تمہاری بیٹی ان چھوئی ہے، اچھوتی ہے اسلئے میں نے اسے اپنے عقد میں لینے کا فیصلہ کیا تھا۔اگر مجھے پتا ہوتا کہ تمہاری بیٹی اپنا کنوارا پن پہلے ہی گنوا چکی ہے تو میں تیرے در پر تھوکنے بھی نہ چلا آتا۔تم نے میرے ساتھ بہت بڑا فریب کیا ہے۔اس کے لئے میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔'' یہ کہکر وہ تن تنا کر اُٹھا اور کوٹھار سے بدر بدر کرتا ہوا نکل گیا۔اُسکے نکلتے ہی اُسکے سارے چمچے بھی ایک ایک کر کے ہوا ہو گئے۔اُنکے جاتے ہی اللہ بخش نے طمانیت کی ایک لمبی سانس لی اور پھر اس بچے کو اُسکی ماں کی گود میں ڈال دیا جو ایک کونے میں دبکی ہوئی بیٹھی تھی اور جسے بچہ لانے کے عوض پچاس روپے دئے گئے۔وہ پیسے لے کر خوشی خوشی رخصت ہوئی۔اُسکے جاتے ہی ماہ جبین دندنا کر باہر آگئی اور بے تحاشہ باپ سے لپٹ گئی۔اللہ بخش نے اُسکے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

''شکر کر بلا آسانی سے ٹل گئی۔مجھے تو یہ کھٹکا لگا تھا کہ کہیں حرام خور ساری الا بلا اپنے سر لینے کے لئے تیار نہ ہو جائے، تب تو بڑی آفت آجاتی۔میرا سارا کیا دھرا نہ صرف اکارت جاتا بلکہ مجھے لینے کے دینے پڑ جاتے۔تم تو جانتی ہو کہ چودھری کتنا کمینہ آدمی ہے۔وہ تو مجھے اُلٹے چھرے سے حلال کر دیتا۔خدا نے تیری اور میری لاج رکھلی۔وہ جھوٹ کو سچ سمجھ کر یہاں سے جل بھن کر چلا گیا۔''

ماہ جبین اپنی کامیابی پر رات بھر خوشی مناتی رہی۔



واسدیو زندہ ہے!

جونہی غلام نبی نے واسدیو کو اپنے گھر کے دروازے پر سجدہ کرتے ہوئے پایا تو اُسکے ہوش فاختہ ہوئے۔ چہرے کا رنگ ایسے فق ہو گیا جیسے اُسے بجلی کا گہرا جھٹکا لگا ہو۔ اُسکی آواز حلق میں جا کر پھنس گئی۔ جب واسدیو دروازے کی چوکھٹ کو چوم کر کھڑا ہو گیا تو غلام نبی بمشکل تمام وہ واسدیو سے پھسپھسا کر بولا۔

''سلام واسہ کاکا''

''تم یہاں میرے گھر میں کیا کر رہے ہو''

''وہ.....وہ'' وہ گڑبڑانے لگا۔

''ارے اب دروازے پر سنتری بن کے کیوں کھڑے ہو۔ ایک طرف ہٹتے کیوں نہیں؟''

''ہاں ہاں ہٹ جاتا ہوں'' وہ ایکدم دروازے سے ہٹ گیا۔ واسدیو گھر کے اندر داخل ہوا۔

اصل میں کرن نگر کا یہ مکان واسدیو کا پشتنی گھر تھا۔ جب وہ سن نوے میں نقل مکانی کر کے چلے گئے تو یہ مکان خالی پڑا تھا۔ کئی سارے خواہش منداس مکان کو خریدنے کی کوشش میں لگے رہے مگر بازی غلام نبی نے ماری۔ غلام نبی نے واسدیو کے بچوں کے ساتھ سانٹھ گانٹھ کر کے یہ مکان اونے

پونے داموں میں خرید لیا۔ باپ کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔ دراصل واسدیو کو اس مکان کے ساتھ ایک جذباتی لگاؤ تھا۔ جب بھی بچے اُس سے مکان کو بیچنے کی بات کرتے تھے تو واسدیو چراغ پا ہوا اُٹھتا تھا۔ وہ ہفتوں بچوں سے بات نہیں کرتا تھا۔ مکان بیچنے کی بات سن کر اُسے ایسے لگتا تھا جیسے کوئی اُسکے ماں باپ کا سودا کرنے آیا ہو۔ اُسے یہ گھر اپنی جان سے بھی زیادہ پیارا تھا۔ بچوں کے لئے یہ سیمنٹ گارے کا مکان تھا مگر واسدیو کے لئے یہ کسی تیرتھ استھان سے کم نہ تھا۔ اس گھر کے ساتھ اُسکی زندگی بھر کی یادیں وابستہ تھیں ۔اُس نے اسی گھر میں جنم لیا تھا۔ اسی گھر میں وہ پلا بڑھا تھا۔ اسی گھر سے اُسکی برات نکلی تھی اور وہ جانکی کو بیاہ کر اس گھر میں لے آیا تھا۔ اسی گھر میں اُسکے بچوں نے جنم لیا تھا۔ اسی گھر میں اُس نے زندگی کے حسین پل گزارے تھے۔ وہ بھلا اس گھر کو بیچنے کی بات کیسے گوارہ کر لیتا۔

واسدیو کا گھر کرن نگر کے جس علاقے میں تھا وہاں زیادہ تر کشمیری پنڈت رہا کرتے تھے۔ چند مسلم گھر بھی تھے۔ یہ سب لوگ آپسمیں شیر وشکر بن کے رہ رہے تھے۔ کبھی آپسمیں کوئی جھگڑا، کوئی چپقلش نہ ہوئی ۔ مسلم پڑوسی ہندوں کے گھر میں بلا روک ٹوک آیا کرتے تھے۔ یہی حال ہندوں کا تھا۔ سکھ دکھ میں دونوں فرقے ایک ساتھ دیکھے جاتے تھے، جب کوئی ہندو شادی ہوتی تھی تو سب سے آگے مسلم عورتیں ہوتی تھیں جو اپنے روایتی ناچ گانے سے سماں باندھتی تھیں ۔ یہ بھائی چارہ ، یہ رواداری صدیوں سے اس وادی کا خاصا رہا تھا۔ یہاں پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ کون ہندو کون مسلمان۔ سب بھائیوں کی طرح مل جل کر رہتے تھے۔

جب ہوا میں زہر پھیل جاتا ہے تو ہوا زہر آلودہ ہو جاتی ہے۔ کشمیر کی وادی میں بھی نفرت کی بادسموم ایسے چلی کہ محبت، رفاقت اور بھائی چارے کی فضا ایک دم زہر آلودہ ہوگئی۔ لوگوں کا انخلا شروع ہوگیا۔ واسدیو کا پریوار بھی شورش کی وجہ سے نقل مکانی کرنے پر مجبور ہو گیا۔ واسدیو تو اپنا گھر چھوڑنے کے لئے کسی بھی قیمت پر تیار نہ تھا مگر بچے تو طے کر کے بیٹھے تھے کہ وہ یہاں سے نکل جائیں گے۔ اُنہوں نے ماں باپ کو زبردستی گاڑی میں ڈال کر جموں پہنچا دیا۔ واسدیو کو لگا جیسے بچوں نے اُسے دار پر چڑھا لیا ہو۔ اُسنے کئی ہفتوں بچوں کی طرف دیکھا تک نہیں ۔ اتنا بیزار تھا وہ بچوں سے۔ پر حالات کا کیا جائے جو بہتر

ہونے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔آئے دن معصوم اور بے گناہ لوگ موت کا نوالہ بنتے جا رہے تھے۔

واسدیو جموں میں خوش نہیں تھا۔اُسے لگ رہا تھا جیسے اُسے جیتے جی ہی جہنم میں ڈال دیا گیا ہو۔اُس سے سب کچھ چھن گیا تھا۔ٹھنڈی ہوائیں،شدھ اور میٹھا پانی،چناروں کے خنک سایے،پھولوں کی مہک،چڑیوں کی چہچہاہٹ،کوئلوں کی کوک،برف پوش چوٹیاں،ڈل کے کنول،ولر کے ندرو،وتستا کی مچھلیاں،اُسکا اڑوس پڑوس،اُسکے یار دوست۔یہاں اُسکا کوئی اپنا نہیں تھا کیونکہ یہاں اُسے کوئی نہیں جانتا تھا۔وہ گھنٹوں سڑک کے کنارے بیٹھا رہتا اور نم ناک آنکھوں سے اُس سمت دیکھتا تھا جہاں اُسکا گھر تھا،اُسکا شہر تھا،اُسکا کشمیر تھا۔باقی کا وقت وہ کرایے کے مکان کی چار دیواری میں ایک قیدی کی طرح رہ رہا تھا۔

اُسنے غلام نبی کو جموں کے گھر میں کئی بار آتے جاتے دیکھا۔ایک بار اُسنے غلام نبی سے پوچھا۔

''بیٹا تم بار بار یہاں آ رہے ہو۔بات کیا ہے۔کہیں میرے بچوں نے تم سے کوئی رقم اُدھار تو نہیں لی ہے؟''

اُس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

''نہیں نہیں انہوں نے مجھ سے کوئی قرض نہیں لیا ہے۔دراصل میں یہاں آپ کے مکان کا سودا کرنے آیا ہوں''

سودا کی بات سنتے ہی واسدیو غصے سے آگ بگولہ ہوگیا۔وہ غلام نبی پر برس پڑا۔

''تم نے میرے گھر کو خریدنے کی بات سوچی کیسے۔؟وہ میرا گھر نہیں میری زندگی ہے،میرا روح ہے۔تم مجھ سے میری زندگی چھین لوگے تو میں جیئوں گا کیسے؟دوبارہ ایسی بات منہ پر لانا بھی مت۔نہیں تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ایکطرف تم لوگ کہتے ہو کہ ہم لوگ آپ کے بنا اُدھورے ہیں۔اپنے اپنے گھروں میں لوٹ کے آجاو۔جس دن ہم لوٹ کے آجائیں گے تو پھر ہم رہیں گے کہاں؟کرن نگر کے شمشان میں کیا؟آج نہیں تو کل حالات سدھر جائیں گے۔تم گھر لے لوگے تو ہم کہاں جائیں گے؟''

غلام نبی جل کر بولا۔

''واسہ کاکا حالات جلدی سدھرنے والے نہیں۔ جب تب حالات سدھر جائیں گے تب تک تمہارا مکان کہیں نظر بھی نہیں آئے گا۔ ابھی کھڑکیاں دروازے چور اُکھاڑ کے لے گئے ہیں۔ کل وہ اینٹیں بھی نکال کر لے جائیں گے تب کیا کرو گے؟ ابھی تو میں مکان کے پیسے دے رہا ہوں۔ کل زمین کے پیسے بھی نہیں ملیں گے۔ یہ ہٹ دھرمی چھوڑ دو اور میرے ساتھ مکان کا سودا کرلو۔ بخدا فائدے میں رہو گے۔''

واسدیو کے کلیجے میں آگ لگی۔ ایسا لگا جیسے کسی نے اُسکے سینے میں خنجر گھونپ دیا ہو۔ جی میں آیا کہ غلام نبی کو کھڑے ہی کھڑے باہر کا راستہ دکھادے تاہم اُسنے اپنے غصے کو پی لیا اور غلام نبی کو ڈانٹتے ہوئے کہا

''گھر میرا ہے۔ چاہے وہ رہے یا ڈھ جائے تم کیوں غم خوار بنے پھرتے ہو؟ اپنی عزت پیاری ہے تو جن قدموں سے آئے ہو اُن ہی قدموں سے لوٹ جاو۔ دوبارہ مجھے اپنی یہ منحوس صورت مت دکھانا۔''

غلام نبی پیچ و تاب کھانے لگا۔ عمر کا لحاظ نہ ہوتا نہیں تو وہ بھی واسدیو کو اپسی کے گھر میں کھری کھوٹی سناڈالتا۔ وہ وہاں سے چپ چاپ چلا تو گیا مگر یہ عہد کر کے گیا کہ جب تک وہ یہ مکان خریدے گا نہیں تب تک چین سے بیٹھے گا نہیں۔ اُسنے واسدیو کو چھوڑ کے اُسکے دونوں بیٹوں کو شیشے میں اُتارا۔ وہ اس مکان کو کب سے بیچنے کے درپے تھے۔ ایک باپ تھا جو اُنکے راستے میں روڑے اٹکا رہا تھا۔ اُن کی مجبوری یہ تھی کہ مکان باپ کے نام پر تھا اور وہ ابھی حیات تھا اسلئے اُسکی رضا کے بنا وہ اس مکان کا سودا نہیں کر سکتے تھے۔ وہ اگر ایسی حماقت کر لیتے تو اُن کو لینے کے دینے پڑ سکتے تھے اسلئے وہ باپ کو منانے کی مسلسل کوشش کرتے رہے مگر اُنہیں کوئی کامیابی نہیں ملی۔ واسدیو کسی بھی قیمت پر اس مکان کو بیچنے پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔ چونکہ وہ کافی تنگی ترشی میں تھے اور ایک پلاٹ خریدنے کے لئے اُنہیں پیسے کی اشد ضرورت تھی۔ اُن کے لئے اس مکان کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ وہ یہ مکان بیچ کر جموں میں اپنا گھر تعمیر کرنا

چاہتے تھے۔ وہ اس مکان کو کیسے بیچیں اُنہیں کوئی راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اُن کی یہ مشکل غلام نبی نے آسان کردی۔ اُسنے جگرا دکھا کر بیٹوں کے مکان کا سودا کر ڈالا۔ اُس نے سوچا کہ واسدیو کتنے دن اور جی لے گا۔ اُسکے پاوں شمشان میں لٹک رہے ہیں۔ آج مرا تو کل دوسرا دن۔ بیٹوں نے غلام نبی کے ساتھ اونے پونے داموں میں مکان کا سودا کرلیا۔ غلام نبی نے عدالت میں جا کر کاغذ بنوا لئے اور دونوں بیٹوں سے اس کاغذ پر دستخط لئے۔ یہ سب کچھ اتنی رازداری سے ہوا کہ واسدیو تو کیا اُسکے فرشتوں کو بھی اس کی بھنک نہیں لگی۔

واسدیو کی حیرت کا اُس دن کوئی ٹھکانہ نہ رہا جب اُسنے دونوں بیٹوں کو نیا گھر تعمیر کراتے دیکھا۔ من میں کئی طرح کے شک وشبہات پیدا ہوئے۔ اُسنے دونوں بیٹوں کو اپنے پاس بلایا اور پھر اُن سے باری باری پوچھا۔

''اس مکان کو بنوانے کے لئے پیسے کہاں سے آگئے؟''

بڑا بیٹا آئیں بائیں شائیں کرنے لگا مگر چھوٹے نے معاملے کو سنبھالا۔ وہ باپ سے آنکھ ملائے بغیر بولا۔

''ہم نے کوئی ڈاکہ نہیں ڈالا ہے۔ بنک سے قرض لیا ہے۔ اسنے دس لاکھ اور میں نے دس لاکھ۔''

''بیس لاکھ قرض لیا ہے تو چکاوگے کیسے؟''

''کیوں۔ ہم دونوں اتنی نکمے ہیں کیا کہ ہم اس قرض کو چکا نہیں پائیں گے۔ آج نہیں تو کل ہم دونوں کو نوکریاں مل جائیں گی۔''

''بیٹا جب دادا جی مریں گے تب بیل بٹیں گے۔ ابھی تو تم دونوں گھر میں بے کار پڑے ہو۔ ایسے شیخ چلی کے خواب مت دیکھا کرو''

وہ کچھ نہیں بولے۔ جان چھڑا کر جلدی سے کمرے سے باہر نکل گئے۔ باہر آکے دونوں نے چین کی سانس لی۔ مکان بن گیا۔ پورا پریوار نئے مکان میں منتقل ہوگیا۔ واسدیو بھی نئے مکان

میں آ گیا مگر اُسنے اس مکان کو کبھی اپنا نہیں سمجھا۔ اُسکے لئے یہ مکان ایک سرائے کی طرح تھا جہاں کوئی تھکا ماندہ مسافر رات دورات کے لئے رک جاتا ہے اور پھر چلا جاتا ہے۔ واسدیو بھی اُس گھڑی کا انتظار کر رہا تھا جب وادی کے حالات سدھر جائیں اور ڈار سے بچھڑے پنچھی اپنے اپنے آشیانوں کو لوٹ آئیں گے۔

ایک دہائی بیت گئی، وادی کے حالات میں کوئی سدھار نہیں آیا۔ واسدیو جس امید فردا پر جی رہا تھا، دھیرے دھیرے اُسکی اُمیدیں مایوسیوں میں بدلتی چلی گئیں۔ وادی کے حالات دن بہ دن ابتر ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اب اُسے ہر طرف اندھیکار ہی اندھیکار نظر آ رہا تھا۔ پہاڑوں کو تکتے تکتے اب اُسکی آنکھیں پتھرانے لگی تھیں۔ کہیں سے اُمید کی ایک رمق دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ اندر ہی اندر سے ٹوٹتا چلا جا رہا تھا۔ گھر کو ایک بار دیکھنے کی تڑپ اُسکے دل و جگر کو بر مار ہی تھی۔ وہ اُس چوکھٹ کو ایک بار چومنا چاہتا تھا جسے چھوڑے ہوئے اُسے ایک دہائی سے بھی زیادہ وقت ہو گیا تھا۔

انتظار کرتے کرتے اُسکی آنکھیں تھک گئیں۔ دل کے ارمان آہستہ آہستہ راکھ ہوتے چلے گئے۔ اُسے لگ رہا تھا جیسے اُسے کسی زندان میں ڈال دیا گیا ہو۔

وہ اس زندان میں گھٹن اور حبس محسوس کر رہا تھا۔ وہ اس زندان خانے کی ساری دیواروں کو توڑ کر اسے منہدم کر کے یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا اور اپنا آخری وقت اپنے اُس آشیانے میں گزارنا چاہتا تھا جہاں وہ اپنی روح چھوڑ کے آیا تھا۔ ادھر واسدیو کی یہ حالت تھی اُدھر غلام نبی کو ہر دم یہ کھٹکا لگا رہتا تھا کہ کہیں واسدیو کے کانوں تک یہ خبر نہ پہنچ جائے کہ اُسکا مکان بک گیا ہے تو وہ اُسکے لئے آفت کھڑی کر دے گا۔ اگر وہ پولیس میں شکایت درج کرالے تو اُسے مکان سے بے دخل کیا جا سکتا تھا۔ اُسنے دستاویزات تو بنوا لئے تھے مگر ان دستاویزات کی کوئی قانونی حثیت نہ تھی۔ بیٹے مکان بیچنے کے مختار نہ تھے۔ وہ مالک مکان کی حثیت سے اس مکان پر کبھی بھی دعوی ٹھونک سکتا تھا۔

اُسکا اندیشہ اب کے سچ ثابت ہوا تھا۔ واسدیو اُسکے سامنے بہ نفس نفیس کھڑا تھا۔ غلام نبی اس قدر بوکھلایا ہوا تھا کہ اُسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ اُس کے سامنے ساری سچائی رکھ دے یا خاموشی اختیار کر لے۔ اُسکے دل و دماغ میں ایک تلاطم مچا تھا۔ ادھر وہ سوچ کے بھنور میں اُلجھا ہوا تھا، اُدھر

واسدیو پاگلوں کی طرح درودیوار کو چومتا جارہا تھا اور روئے جارہا تھا۔ اُسے جیسے یقین ہی نہیں آرہا تھا وہ اپنے گھر میں آ گیا ہے اور اُن درودیواروں کو چھورہا ہے جن میں اُسکی زندگی بسی تھی۔

غلام نبی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس بڑھے کا کیا کرے۔ اس گھر میں بیٹھنے دے یا اسکا ٹیٹوا دبادے۔ وہ تو اُسکے لئے آفت بن کے آگیا تھا۔ اس سے پہلے کہ اُسے اس بات کا پتا لگ جائے کہ اسکا مکان بک چکا ہے اُسنے سوچا کہ بہتر یہی ہوگا کہ اسکو اُلجھا کے رکھ دے۔ یہی سوچ کر اُسنے اوپری دل سے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے واسدیو کے لئے ایک چھوٹا سا غالیچہ بچھا دیا اور پھر واسدیو کو بیٹھنے کے لئے کہا۔

''کاکا آؤ یہاں بیٹھ جاؤ۔''

واسدیو چپ چاپ نیچے بیٹھ گیا۔ غلام نبی نے ایک مصنوعی مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھیرتے ہوئے کہا۔

''واسہ کاکا کونسی چائے پیوگے۔ میٹھی یا نمکین؟''

''اتنے سالوں کے بعد اپنے گھر آیا ہوں۔ نمکین چائے ہی پیوں گا''

''ابھی لے کر آتا ہوں''

کہہ کر وہ کچن میں چلا گیا۔ اُسکی بیوی حاجرہ جو کہ دروازے کی اوٹ میں کھڑی تھی سرگوشی کے انداز میں شوہر سے بولی۔

''اب اس کا کیا کروگے۔ یہ تو ابھی بھی اس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھ رہا ہے''

''تم پریشان مت ہو جاؤ۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم جلدی سے ایک دو کپ چائے بجھوادو میں تب تک اس بڑھے کو اُلجھا کے رکھتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ واسدیو کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ واسدیو نے غلام نبی سے پوچھا۔

''اس دیوار پر میرے دیوی دیوتاؤں اور میرے ماں باپ کی تصویریں آویزاں تھی وہ سب کہاں ہیں؟''

غلام نبی کا رنگ ایک بار پھر اُڑ گیا۔ تھوڑے توقف کے بعد اُسنے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

''وہ تصویریں۔ اُن میں دیمک لگ گئی تھی۔ پوری طرح اُنہوں نے اُن تصویروں کا چاٹ لیا تھا۔ میں نے بچے کھچے ٹکڑوں کو جہلم میں بہا لیا۔''

''اچھا کیا۔ اچھا کیا''

غلام نبی کی جان میں جان آ گئی۔ اُسنے راحت کی سانس لی۔ اس سے پہلے کہ واسدیو مزید کوئی استفسار کرے اُسنے اُسکا دھیان ہٹانے کے لئے جونہی اپنا منہ کھولنا چاہا واسدیو نے پوچھا۔

''اُس کمرے میں میری پوجا کی سامگری تھی وہ کہاں رکھ دی ہے؟''

اب کے غلام نبی کو کچھ سوجھا نہیں۔ وہ اُسے ٹالتے ہوئے بولا۔

''کاکا رات کو کیا کھاؤ گے؟''

''اتنے سالوں بعد گھر لوٹا ہوں۔ خانیاری ساگ اور ولر کے ندرو ضرور کھاؤں گا۔ برسوں سے ان چیزوں کو کھانے کے لئے ترس گیا ہوں۔ اور ہاں کل ڈل سے میرے لئے پمپوش کے ایک دو پھول ضرور لے کر آ جانا۔ برسوں سے میں نے شوجی کو پھول نہیں چڑھائے۔''

''ارے کاکا تمہارے لئے جان حاضر ہے۔ کل کیا میں آج ہی یہ ساری چیزیں لے کر آؤں گا۔ ایک بات پوچھوں برا مت ماننا۔ تم یہاں آئے کیسے اور یہاں کتنے دن رکنے کا ارادہ ہے؟''

غلام نبی کی بات سے واسدیو کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ اُسنے تیکھی نظروں سے غلام نبی کی طرف دیکھا اور پھر ترش روئی کے ساتھ پوچھا۔

''تم نے یہ سوال کیا کیوں؟ میں اپنے گھر میں آیا ہوں۔ کیا اپنے گھر میں آنے کے لئے مجھے تم سے اجازت لینی ہوگی۔ میرا دل جب تک کرے تب تک میں یہاں رہوں گا۔ تم بتاؤ تم کب یہاں سے دفا ہو رہے ہو۔ چوکیداری کے بہانے تم نے میرے گھر کا نقشہ ہی بدل کے رکھ دیا ہے۔''

غلام نبی کا چہرہ اُتر گیا۔ اُسنے سوچا کہ یہ بڑھا یہاں سے جلدی ٹلنے والا نہیں ہے۔ اُسنے مصلحت سے کام لے کر اپنا منہ بند رکھا اور واسدیو کی آڑی ترچھی چپ چاپ سن لی۔ اُس سے اُلجھتا تو وہ ہنگامہ کھڑا کر دیتا۔ اُسنے بہتر یہی سمجھا کہ بڑھے کی دل کھول کے خاطر داری کی جائے۔ دونوں میاں بیوی اُسکے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے جیسے وہ اُسکے غلام ہوں۔ وہ جس چیز کی فرمائش کرتا وہ دوڑ کر وہ چیز اُسکے سامنے رکھ دیتے تھے۔ دو دن اور دو راتیں اُنکے سروں پر ننگی تلوار لٹکی رہی۔ تیسرے دن واسدیو نے اپنی پوٹلی اُٹھائی اور غالم نبی سے کہا۔

''میں شادی پور جا رہا ہوں۔ وہاں میرے بچے میرا انتظار کر رہے ہونگے۔''

غلام نبی کو لگا جیسے واسدیو نے اُنہیں مژدہ جانفزا سنا دیا ہو۔ وہ بلیوں اُچھل پڑا۔ اُسنے اُس سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ شادی پور کس لئے جا رہے ہو؟ وہاں تمہارے بچے تمہارا انتظار کس لئے کر رہے ہیں۔ اُسنے خوش ہو کر واسدیو سے کہا۔

''ہاں ہاں خوشی خوشی جاو۔ یہاں کی بالکل فکر مت کرنا۔ میں تمہارے گھر کا پورا پورا خیال رکھوں گا۔ کہو تو میں ٹیکسی لے کر آ جاوں؟''

''زندگی بھر سرکاری بسوں میں سفر کیا۔ ٹیکسیوں میں سفر کرنے کی عادت نہیں رہی۔ میں بس میں بیٹھ کر چلا جاوں گا''

کہہ کر وہ اپنی پوٹلی لے کر گھر سے نکل گیا۔ اُسکے جانے کے بعد حاجرہ اور غلام نبی نے چین کی سانس لی۔

چوتھے روز واسدیو کے دونوں لڑکے غلام نبی سے ملنے آئے۔ اُن دونوں کے سر منڈھے ہوئے تھے۔ غلام نبی اُنہیں دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ آ کے غلام نبی کے گلے ملے۔ گلے ملنے کے بعد غلام نبی نے اُن سے کہا۔

''میں جانتا ہوں تم یہاں کیوں آئے ہو۔ وہ یہاں آیا تھا۔ دو دن یہاں رہا پر مکان کے سودے کے بارے میں اُسنے کوئی سوال نہیں کیا۔ کل صبح وہ شادی پور کے لئے نکل گیا۔ کہا میرے بچے

وہاں میرا انتظار کرر ہے ہو نگے"

دونوں نے غلام نبی کی طرف حیرت سے دیکھ کے کہا۔

"تم کس کی بات کرر ہے ہو؟"

"تمہارے باپ واسہ کاک کی"

"کیا بات کرتے ہو تم ۔ وہ یہاں کیسے آسکتا ہے۔ چار دن پہلے تو اُسکا سور گباش ہوا۔ کل ہی ہم اُسکی استھیاں شادی پور میں بہا کر آئے ہیں"

غلام نبی دھم سے نیچے بیٹھ گیا اور پھر اپنا سر پکڑ کر یوں رونے لگا جیسے اُسکا باپ آج ہی مر گیا ہو۔



رادھے شیام کی لیلا

رادھے شیام سے میری دوستی کالج کے دنوں میں ہوئی تھی۔ وہ بے حد شرمیلا، کم گو اور سنجیدہ قسم کا انسان تھا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب لڑکے لڑکیاں کالج میں ایک ساتھ پڑھتی تھیں۔ دوسرے لڑکے پڑھائی کے مقابلے لڑکیوں کو رجھانے میں زیادہ فعال نظر آتے تھے جب کہ رادھے شیام پڑھائی میں بہت تیز تھا۔ اُسے پڑھائی کے علاوہ کسی اور چیز میں دلچسپی نہیں تھی۔ وہ بڑا پر وجیہہ نوجوان تھا۔ بدن چھریرا، آنکھیں بنفشی، بال گھنگھریالے، فراخ پیشانی۔ ایسی شکل وصورت والے نوجوان کے لئے کسی بھی لڑکی کو پٹا نا آسان تھا مگر مشکل یہ تھی کہ اُسکی طبیعت میں زرا سی بھی رومانیت نہیں تھی۔ نہ ہی وہ حسن پرست اور نہ ہی عاشق مزاج تھا۔ اُسے تو ہر عورت میں ماں بہن ہی نظر آتی تھی۔ عشق ومحبت جیسے الفاظ اُسکی ڈکشنری میں تھے ہی نہیں۔ وہ ان چیزوں کو تضع اوقات سمجھتا تھا۔ عشق کرنا، لڑکیوں سے آنکھیں لڑانا، یا اُنہیں چھیڑنا۔ اس طرح کی خرمستیاں کرنا نوجوانی کا ایک فطری عمل ہوتا ہے۔ یہی تو عمر ہوتی ہے سرمستی اور دیوانگی کی۔ اسکے بعد زندگی اپنے اصلی روپ میں آ کے کھڑی ہو جاتی ہے اور پھر ایک نوجوان طرح طرح کی بندشوں میں جکڑ جاتا ہے۔ رادھے شیام کو نہ آج کی فکر تھی نہ آنے والے کل کی۔ اُسنے تو جیسے زندگی کے رنگین خوابوں اور خیالوں کو ذہن کے کسی اندھیرے کونے میں دفن کر کے رکھ دیا تھا۔ اُسکے بشرے سے بیزاری اور وحشت ٹپک رہی تھی۔ اُسے دیکھ کے لگ رہا تھا گویا وہ قنوطیت پسندی کا شکار ہو چکا ہو۔ اُسکی چوڑی پیشانی پر فکر وتردد کی سلوٹیں اتنی گہری ہوتی جا رہی تھیں جیسے ان سلوٹوں میں اُسنے ساری دنیا کا درد والم چھپا کے رکھا ہو اور ایک دن وہ اس سنسار کو تیاگ کر بادیہ پیمائی کے واسطے نکل جائے گا اور پھر نروان پانے کے

لئے خوب تپ اور تیاگ کرے گا اور ایک دن مہاتما بدھ کی طرح نروان حاصل کر کے رہے گا۔

رادھے شیام کی کہانی میں ٹھہراو کم اُتار چڑھاو بہت زیادہ تھا۔ وہ تین بھائی تھے۔ دو شادی شدہ تھے۔ ایک کنوارا اور یہ تیسرا کنوارا رادھے شیام تھا جو کہ سب سے چھوٹا تھا۔ جب تک اُسکی ماں حیات تھی، وہ بڑی بے فکری کی زندگی جی رہا تھا۔ ماں تینوں میں اُسے ہی زیادہ پیار دلار کرتی تھی۔ ماں جیسے اسکی زندگی کی محور تھی اور وہ اسی محور کے گرد گردش کرتا رہتا تھا۔ وہ چلی گئی تو رادھے شیام ایک ٹوٹے تارے کی طرح فضا میں جیسے ریزہ ریزہ ہو کے رہ گیا۔ اُسکی باغ و بہار زندگی میں جیسے خزاں چھا گیا۔ اُسکے چہرے کی شادابی کو جیسے گھن لگ گیا۔ اُسکے متبسم ہونٹوں کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ وہ بولتا تھا تو لگتا تھا جیسے وہ رو رہا ہو۔ وہ ہر دم اُداس اور افسردہ رہنے لگا۔ اُسکے پتا جی اُس کی حالت دیکھ کر اندر ہی اندر کُڑھتے رہتے تھے۔ اُنہوں نے اپنی طرف سے اُسکی دل جمعی کرنے کی بہت کوشش کی مگر وہ اُسکے دل سے اُسکی ماں کی جدائی کے غم کو مٹا نہ سکے۔

اُسنے ایک سال کے بعد کالج کو الوداع کہہ دیا اور گھر میں جا کے بیٹھ گیا۔ بھائیوں نے اُسے ملازمت دلانے کی انتھک کوشش کی۔ اُنہیں کامیابی ملی تو رادھے شیام نے نوکری کرنے سے انکار کر دیا۔ بھائیوں سے زیادہ بھابیوں کو اُسکے اس فیصلے پر تاو آ گیا۔ وہ اُسے طعنے مارنے لگے۔

"جسے مفت کی روٹیاں توڑنے کی عادت پڑ جائے وہ ہاتھ پاوں کیوں ہلائے۔ کتے سے بھی مفت کی روٹی ہضم نہیں ہوتی۔ وہ بھی ایک روٹی کے بدلے رات بھر گھر کی رکھوالی کرتا رہتا ہے۔ اسے دیکھو یہ تو کتے سے بھی گیا گزرا ہے"

رادھے شیام کا دل چھلنی چھلنی ہو جاتا تھا۔ وہ اپنے پتا کی طرف دیکھتا تو وہ بے بسی میں اپنا سر جھکائے بیٹھے رہتے تھے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ کام کرنا نہیں چاہتا تھا۔ غیرت کا مادہ اُسمیں بدرجہ اُتم موجود تھا مگر اُسکے بھائی جس طرح کی نوکری اُس سے کروانا چاہتے تھے وہ اُسے قبول نہیں تھی۔ اسپتال میں وارڈ بوائے کی نوکری، یعنی مریضوں کا بول براز اُٹھاو۔ اُنکا فضلہ لیبارٹری میں جمع کرا کے آو۔ اُنکے زخم دھو لو۔ اُسکی بھی کچھ عزت تھی۔ وہ اتنا گیا گزرا نہیں تھا کہ چند روپیوں کے لئے اپنی خاندانی وجاہت، اپنے

باپ کی عزت اور اپنی غیرت کو بیچ دیتا۔ بھائی تو اُس سے اتنے بیزار نہیں رہتے تھے جتنی اُنکی بیویاں۔ اُنہوں نے اپنے اپنے شوہروں کو متنبہ کیا کہ آئندہ سے وہ اسکے لئے کسی کا احسان نہ لیں۔ اسے جو کرنا ہوگا خود ہی کرلے گا۔ باپ روز افزوں اُسکی بگڑتی صحت سے پریشان تھے۔ اب گھر میں اُسکی کوئی قدر و قیمت نہ رہ گئی تھی۔ وہ تو گھر کا کتا بن کے رہ گیا تھا جسے بلا وجہ ہر کوئی دُر دُر تھو تھو کر کے بھگاتا تھا۔ وہ آتا تھا تو اُسکے سامنے کھانے کی تھالی رکھی جاتی تھی۔ وہ کھائے نہ کھائے کوئی اسکی پرواہ نہ کرتا تھا۔ اُسکا والد اپنی بہوں کے اس رویے کو دیکھ کر من مسوس کے رہ جاتا تھا مگر وہ لاچار تھا۔ کچھ بول نہیں سکتا تھا کیونکہ بیوی کے چلے جانے کے بعد اب گھر میں اُسکا وہ دبدبہ نہ رہا تھا۔

اُسکے بابو جی چاہتے تھے کہ اُسکا گھر بس جائے مگر ایک بے کار کے پلے کوئی اپنی بیٹی کو کیسے باندھے۔ آدمی غلطی سے مکھی نگلے تو نگلے، آنکھوں دیکھی مکھی کوئی نہیں نگلتا۔ اُسکی جوانی تیزی سے ڈھلتی جا رہی تھی۔ اندگی کی تیس بہاریں دیکھنے کے باوجود اب تک اُسکی زندگی میں کوئی لڑکی نہیں آئی تھی۔ بے رحم حالات نے اُسے اتنا بے مروت اور پتھر دل بنایا تھا کہ اُسنے اپنے ہاتھوں سے اپنی جوانی کے مچلتے ہوئے ارمانوں کو کچل کے رکھ دیا تھا۔ عورت اُسکے لئے شجر ممنوعہ بن کر رہ گئی تھی۔ وہ اپنی ماں کو چھوڑ کے کسی بھی عورت کو اپنی زندگی میں آنے نہیں دینا چاہتا تھا۔

رادھے شیام نے اپنی ذات کو اپنے تک ہی محدود کر کے رکھا تھا۔ وہ اپنے من کی بات وہ بہت کم لوگوں سے سانجھا کرتا تھا۔ اُس نے دوستوں سے زیادہ دشمن بنا لئے تھے۔ جن دنوں ہم کالج میں تھے تو میں نے ایک دن اُس سے پوچھا تھا کہ وہ لڑکیوں سے دور کیوں بھاگتا ہے۔ پہلے تو وہ اس سوال کو ٹالنے کی کوشش کرنے لگا مگر جب میں بھی سر پڑ گیا تو اُسنے اپنا دل کھول کے رکھ دیا۔

میں جس طرح کا آدمی رادھے شیام کو سمجھ رہا تھا وہ تو بالکل اُسکے اُلٹ تھا۔ وہ بڑا رومان پسند اور جذباتی قسم کا آدمی تھا۔ ہوا یوں تھا کہ ایک دن اُسکی بوا راج رانی جو کہ شہر میں بیاہی گئی تھی اپنی دونوں بیٹیوں کے ساتھ اُن سے ملنے چلی آئی۔ اُسکی دو بیٹیاں نرملا اور کملا۔ نرملا عنفوان شباب میں قدم رکھ چکی تھی جب کہ کملا ابھی کم سن تھی۔ نرملا بیحد خوبصورت تھی۔ چھریرے بدن والی نرملا کے خدوخال بڑے

تیکھے اور قاتلانہ تھے۔ جب وہ مسکراتی تھی تو لگتا تھا جیسے گھٹاٹوپ اندھیرے میں بجلی چمکی ہو۔ جب وہ ہنستی تھی تو لگتا تھا جیسے کسی رقاصہ کے پاوں کے گھنگرو پہلی بار کھنکے ہوں۔ وہ بولتی تھی تو لگتا تھا جیسے کوئی وائلین کی تاروں پر سر لگا رہا ہو۔ جب وہ ہلکے گلابی رنگ کا سوٹ پہن کر کانوں میں نقرئی آویزے ڈال کر رادھے شیام کے سامنے آکے کھڑی ہوگئی تو پہلی بار رادھے شیام کا دل ڈولنے لگا۔ اُسے لگا جیسے اُسکا دل اُچھل کر اُسکے حلق میں آکر اٹک گیا ہو۔ پیار کے سوئے ہوئے جذبات ایک چھناکے کے ساتھ اُسکے من کی وادیوں میں مچلنے لگے۔ اُسکے احساسات کی بالا دریوں میں چاہت کی پھلجڑیاں پھوٹنے لگیں۔ وہ مسحور ہوکر نرملا کو بس یک ٹک دیکھتا رہا۔ ایک پل میں جیسے اُسکے اصولوں کے بلند ایوان زیر وزبر ہوکے رہ گئے۔ وہ خود حیران تھا کہ آخر یہ اچانک اُسے ہوا کیا۔ وہ جو کل تک عورتوں کے سایے سے بھی دور بھاگتا تھا، اس لڑکی کو دیکھ کر اتنا رومانی کیسے ہوگیا؟ اس میں رادھے شیام کی کوئی خطا نہیں تھی۔ دھرتی مہینوں اپنی کوکھ میں بیج چھپا کے رکھتی ہے۔ بے حس اور بے جان پڑے یہ بیج بہار کی دستک سنتے ہی جی اُٹھتے ہیں اور پھر دھرتی کا سینہ پھاڑ کر باہر آجاتے ہیں۔ کلی اور کونپل کے روپ میں۔ رادھے شیام بھی اپنے جذبات کو سالوں سے دبا کے بیٹھا تھا۔ اب جب کہ ایک پری وش نے اُسکے جذبات کو چھولیا تھا تو وہ بیقراری محسوس کرنے لگا تھا

دو چار دن تک اُسے سمجھ ہی نہیں آیا کہ اُسے کیا ہوگیا ہے۔ آخر نرملا نے اُس پر یہ کیسا جادو کر دیا کہ وہ لوہے کے ایک ٹکڑے کی طرح اس مقناطیس سے چپک کر رہ گیا۔ عورت اُس ہرنی کی طرح ہوتی ہے جو شروع شروع میں آدمی کو دیکھ کر قلانچیں بھرتی ہوئے بھاگ کھڑی ہوتی ہے اور مرد اُسکے پیچھے پاگلوں کی طرح پیچھے پیچھے پھرتا رہتا ہے۔ رادھے شیام بھی نرملا کے پیچھے بھاگتا رہا۔ وہ رکتی تو وہ پاس جا کر اُسے بس نہارتا رہتا تھا۔ اُسکی آنکھیں تھیں یا کوئی تشنہ ساگر جن کی پیاس مٹتی ہی نہیں تھی۔ نرملا اپنے الھڑ پن میں بھی اُسکے ارادوں کو بھانپ چکی تھی پھر بھی وہ جان بوجھ کر اُسے دوڑاتی، پھر شرما کے چلی جاتی تھی۔ عورت کو اپنے عاشق پر اپنی نازک اداوں سے بجلیاں گرانے میں مزہ آتا ہے جب کہ مرد بیچارا جل جل کر خاک ہو جاتا ہے۔

ایک دن جب وہ چھت پر چڑھ گئی تو رادھے شیام بڑی ہمت کر کے اُسکے پیچھے پیچھے

چھت پر چڑھ گیا جہاں وہ برج کے نیچے بیٹھی شاید اُسی کا انتظار کر رہی تھی۔ رادھے شیام نے اپنے بکھرے حواسات بڑی مشکل سے یکجا کر کے رکھے اور محبت کے دیوانوں کی کہانیاں یاد کر کے آگے بڑھنے لگا۔ اُسنے مجنوں کی بادیہ پیمائی کو یاد کیا۔ اُسنے فرہاد کی کوہ کنی کو یاد کیا، مہیوال کی آب طوفانی کی معرکہ آرائی کو یاد کیا۔ ان عاشقوں کی قربانیوں کو یاد کر کے وہ اپنا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔ انہی کا ورد کرتے کرتے وہ اُسکے پہلو میں جا کر بیٹھ گیا اور دھیرے سے اُسکا ہاتھ پکڑ لیا۔ اُسنے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ نرملا کا لمس پا کر رادھے شیام کے بدن میں آگ لگی۔ اُسکے جذبات متلاطم ہو اُٹھے تھے۔ ایسی کھلبلی اس سے پہلے اُسنے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ دوسروں کو بڑے بڑے اُپدیش دینے والا اس وقت سارے فلسفے، سبھی منطقیں بھول چکا تھا اور وہ ایک خزان زدہ پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ وہ کوئی گناہ کرنے نہیں جا رہا تھا۔ بس اپنا حال دل اپنی محبوبہ کو سنانا چاہتا تھا پھر بھی نہ جانے اُسے ایسا کیوں لگ رہا تھا جیسے اُسکے خفتہ جذبات یکا یک برانگیختہ ہو اُٹھے ہوں اور یہ جذبات جنسی تکمیل کے متقاضی ہوں۔ جس جوانی کو اُسنے برسوں سے دبا کے رکھا تھا وہ جوانی اپنی پوری سرمستی کے ساتھ اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

اُسکے بدن میں جھرجھری کی لہر دوڑ گئی۔ اُسنے نرملا کی طرف دیکھا۔ اُسکے گال شفق زار بن چکے تھے۔ اُس کے کانوں کے آویزے ایسے لرزنے لگے جیسے اُسکے اندر بھی ایک بھونچال آ گیا ہو۔ اُسنے گھبرا کے رادھے شیام سے کہا۔

''میرا ہاتھ چھوڑئے۔ کوئی آ جائے گا؟''

''اس وقت یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں پڑے ہیں۔''

''پھر بھی احتیاط ضروری ہے''

''نرملا جی ایک بات کہوں۔ برا مت مانئے گا۔ ہمیں آپ سے پیار ہو گیا ہے''

نرملا پیار کے اس اظہار سے گلنار ہو گئی۔ وہ مخمور آنکھوں سے اُسکی طرف دیکھ کے بولی۔

''آپ نے مجھے بھی دیوانہ بنا ڈالا ہے۔ جب سے آپ میرے پیچھے پڑے ہیں تب سے میں صرف آپ کے بارے میں ہی سوچتی رہتی ہوں۔ بس ایک بات کا ڈر ہے مجھے۔ کیا ہمارا ملن ہو

پائے گا؟"

"آپ اگر میرا ساتھ دوگی تو یہ ملن ہو کر ہی رہے گا۔ میں سماج سے لڑوں گا۔ زمانے سے لڑوں گا۔ انجام جو بھی ہو میں پیچھے نہیں ہٹوں گا۔"

"وہ سب تو ٹھیک ہے مگر سماج کے بھی اپنے کچھ اصول ہوتے ہیں، جنہیں توڑنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ ایک بار سوچ لو۔ ایسا نہ ہو کہ ہمیں بعد میں اپنے فیصلے پر پشیمان ہونا پڑے۔"

"اب سوچنا کیا ہے۔ جب اوکھلی میں سر دیا تو موسلوں سے کیا ڈر۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا" کہہ کر وہ اُٹھ کے چلے گئے۔ رادھے شیام ہوا کے دوش پر سوار آکاش کی بلندیوں میں اُڑتا چلا جارہا تھا۔ نرملا کے اقرار محبت نے اُسکے چاہت کے جذبے کو نئی رفعتوں تک پہنچا دیا تھا۔ اُس رات وہ خوشی کے مارے سو نہیں پایا۔ رات بھر وہ زندگی کے حسین سپنوں کے تار پور بنتا رہا۔ ایک چھوٹا سا گھر۔ نرملا جیسی ایک پیاری سی بیوی، دو چھوٹے چھوٹے بچے۔

رات ہوتے ہی وہ چھت پر چڑھ جاتے تھے اور پھر چاند کی نقرئی کرنوں میں نہلاتے ہوئے اپنی محبت کا اظہار کرتے۔ عہد و پیمان باندھتے۔ ساتھ جینے اور ساتھ مرنے کی قسمیں کھاتے۔ وہ نرملا کی بنفشی آنکھوں میں ڈوب جاتا تھا اور نرملا اُسکی چوڑی چھاتی میں سر چھپا کر ایک نئی دنیا کے تصور میں کھو جاتی تھی۔ کتنے رنگین لمحے تھے وہ۔ کتنی موہنی راتیں تھیں۔ پونم کی رات تھی۔ چاند پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ رادھے شیام کو اس نقرئی چاندنی سے ڈر لگ رہا تھا۔ کتنا حسین اور روح پرور منظر تھا۔ ایسی ہی چاندنی راتوں میں عشق کے پھول کھلتے ہیں۔ محبتیں پروان چڑھتی ہیں اور۔ چاند کو گواہ بنا کر ساتھ جینے اور مرنے کے عہد و پیمان باندھے جاتے ہیں۔ ایسی ہی چاندنی راتوں میں محبوب اپنی محبوبہ کو اپنی بانہوں میں بھر لیتا ہے۔ اُسکے لمس سے آشنا ہوتا ہے۔

کہتے ہیں عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ ایک دن رادھے شیام کی بڑی بھابی نے اُنہیں چھت پر جاتے دیکھ لیا۔ اُسنے اپنے شوہر کو خبر کی۔ بڑے بھائی نے منجھلے کو ساتھ لیا۔ سارے لوگ چھت پر چڑھ گئے اور دونوں کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ گھر والوں کو دیکھ کر رادھے شیام کی شریانوں میں دوڑتا

ہوا لہو جم گیا۔ اُسکا جذبہ جنون پانی کے بلبلے کی طرح ٹھس سے بیٹھ گیا تھا۔ اُسکے مچلتے ارمان سر کٹے پنچھی کی طرح تڑپنے لگے۔ گھر میں بہت بڑا بھونچال آ گیا تھا۔ اُسکے کردار کا بت ایک پل میں ریزہ ریزہ ہو کے رہ گیا تھا۔ بھائی اُسے برا بھلا کہنے لگے۔ بھابیاں اُسے کوسنے دینے لگیں۔ نرملا تو ایسے کھڑی تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ رادھے شیام بت بنا کھڑا تھا۔

بات بابو جی تک پہنچ گئی۔ اُنہوں نے جب یہ مژدہ سنا تو وہ چکرا کے رہ گئے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ نرملا کو کل صبح اپنے گھر روانہ کیا جائے اور اس بات کو یہیں دفن کیا جائے کیونکہ اگر یہ بات یہاں وہاں پھیل گئی تو نرملا کے نام پر دھبہ لگ جائے گا اور پھر اُس کی شادی نہیں ہو پائے گی۔ رادھے شیام جو بہت دیر سے چپ تھا۔ یکا یک بول پڑا۔

''سارے فیصلے آپ ہی لو گے یا ہم سے بھی ہماری رائے پوچھ لو گے۔ ہم نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے بلکہ ہم ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں اور شادی کرنا چاہتے ہیں''

اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ بول پاتا، ایک زناٹے کا تھپڑ اُسکے گال پر پڑا جس سے وہ تیورا کے نیچے گرا۔ یہ بابو جی تھے جو آگ بگولا ہو کے کانپ رہے تھے

''کیا کہا کمبخت۔ اسے شادی کرنا چاہتا ہے۔ تم ہوش میں ہو کیا۔ یہ تیری بوا کی بیٹی ہے ۔ایک طرح سے یہ تمہاری بہن ہے۔''

''بوا آپ کی بہن ہے بابو جی میری نہیں۔ نرملا میری بہن ہو ہی نہیں سکتی۔ ایسے فرسودہ مفروضے دہرا کر ہماری زندگی میں کانٹے بونے کی کوشش مت کیجیے۔ میں کوئی بچہ نہیں ہوں جسے آپ ڈرا دھمکا کر چپ کرائیں گے۔ میں نے طے کیا ہے کہ یہی میری شریک حیات بنے گی۔ آپ مانیں یا نہ مانیں میں اپنے فیصلے سے ٹلوں گا نہیں''

''ہوش کے ناخون لے رادھے۔ یہ رشتہ ہونا تو دور تم ایسا سوچ بھی نہیں سکتے۔ سماج تمہیں سنگسار کر دے گا۔''

''بابو جی میں آپ کے فرسودہ سماج کو نہیں مانتا ہوں۔ یہی ہندو سماج ہے جو ساتھ میں

ماما کو بھانجی سے شادی کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ یہی سماج یہاں رشتوں کی دہائی دے کر دو دلوں کو ملنے سے روک دیتا ہے۔ مجھے اس سماج کی پرواہ نہیں جسکے قوائد اور ضابطے پہلے ہی تضاد کا شکار ہیں۔ میں وہی کروں گا جو میرا دل کہے گا۔ اسکے لئے مجھے کسی سے اجازت لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے''

ہر کوئی دم سادھے کھڑا تھا۔ بابو جی غصے سے اُبل رہے تھے۔ اُنہوں نے تہدیدی انداز میں رادھے شیام سے کہا۔

''میں تمہیں اپنی جائیداد سے عاق کر دیتا ہوں۔ آج سے تم میرے بیٹے نہیں اور نہ میں تمہارا باپ''

''میں تو ماں کے مرنے کے بعد تو لاوارثوں کی طرح جی رہا ہوں۔ آپ مجھے آج یتیم کر رہے ہیں۔ میں تو برسوں پہلے یتیم ہو چکا ہوں''

کہہ کر وہ نرملا کی طرف بڑھا اور اُسکا ہاتھ پکڑ کر اُسے وہاں سے لے گیا۔

اس روز کے بعد وہ گاوں میں دکھائی نہیں دیا۔ نرملا کو اپنے گھر میں چھوڑ کر وہ نوکری کی تلاش میں بھٹکتا رہا۔

اس واقعے کے بعد رادھے شیام جیسے اندر ہی اندر بجھ سا گیا۔ چہرے کی چمک ماند پڑ گئی۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئیں۔ ہونٹوں کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ وہ دن بھر اپنے کمرے میں بیٹھا اپنی نوزائیدہ محبت کا سوگ مناتا رہتا تھا۔

ایک دن وہ مجھے گاوں کی ندی کے پاس بیٹھا ہوا ملا۔ بڑا اُداس اور پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اُسے اس حال میں دیکھا تو جا کے اُس سے پوچھا،

''کیوں بھئی رادھے شیام کس کے فراق میں بیٹھے آہیں بھر رہے ہو؟''

اُسنے چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر ایک ٹھنڈی آہ بھر کو بولا۔

''اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا''

''اور کون سے غم کچھ وضاحت تو کر دے؟''

''مجھے اپنا بوجھا اکیلے ہی ڈھونے دو نا۔ تم کیوں پرائی آگ میں کودنا چاہتے ہو؟''

''بھئی دوست ہوں تمہارا۔ میرے ساتھ اپنے دکھ بانٹو گے تو من کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ کہو نا کیا بات ہے؟''

اب کے اُسکی آنکھوں میں ہلکی سی نمی تیرنے لگی اور وہ رندھی ہوئی آواز میں بولا۔

''چاہتا تو نہیں تھا کہ اپنے دل کے راز عام کر دوں مگر انہیں اپنے دل میں رکھ رکھ کے میں جی بھی تو نہیں پا رہا ہوں۔ بات یہ ہے کہ مجھے محبت ہو گئی ہے''

''تو مسلہ کیا ہے؟''

''مسلہ چھوٹا سا نہیں بلکہ بہت بڑا ہے۔ وہ جو لڑکی ہے میری رشتہ دار ہے، میری بوا کی لڑکی۔''

''اوہ یہ تو بڑا اسیریس معاملہ ہے۔ مجھے لگتا ہے یہ بیل منڈھے چڑھے گی نہیں''

''بالکل درست کہا۔ جب سے گھر والوں کو اس بات کی بھنک لگ گئی ہے، سب لوگ مجھ سے اُکھڑے اُکھڑے سے رہنے لگے ہیں۔ کوئی مجھ سے بات نہیں کرتا۔ میں ایک طرح سے اپنے ہی گھر میں اجنبی بن کے رہ گیا ہوں۔''

''دیکھ جہاں تک میں سمجھتا ہوں، تمہارے گھر والے کبھی اس بات کے لئے حامی نہیں بھریں گے کیونکہ رشتہ داری میں شادی ہونا ممکن نہیں''

واقعی مسلہ کافی گھمبیر تھا۔ میرے پاس بھی اس مسلے کو سلجھانے کا کوئی فارمولہ نہیں تھا۔ میں اُٹھ کے چلا گیا۔

مجھے روزگار کے سلسلے میں دلی میں جا کر رہنا پڑا۔ رادھے شیام سے کئی برسوں تک میرا کوئی رابطہ نہیں رہا۔ کبھی کبھار میں اُسکے بارے میں سوچتا تو ایک ٹھنڈی آہ بھر کر رہتا تھا۔ چار سال کے بعد جب میں گھر لوٹا تو مجھے رادھے شیام یاد آ گیا۔ ایک دن میں اُس سے ملنے اُسکے گھر پہنچا۔ پتا چلا کہ وہ اب اپنے آبائی گھر میں نہیں رہتا۔ باپ کے مرنے کے بعد اُسکے بھائیوں نے اُسے جائیداد سے بے دخل کر

دیا۔ وہ اب ایک کرایے کے مکان میں رہتا تھا۔ میں نے اُس سے ملنے کی ٹھان لی تھی سو میں ڈھونڈ تے ڈھونڈ تے اُس تک پہنچ گیا۔ جب میں نے رادھے شیام کو دیکھا تو پہلی نظت میں اُسے پہچان ہی نہیں پایا۔ وہ سوکھ کر کانٹا ہو چکا تھا۔ اُسکے بال جھڑ گئے تھے اور دو چار دانت گر بھی چکے تھے۔ اُس کی نظر بھی کمزور ہو چکی تھی۔ میں نے کہا۔

"رادھے شیام اپنے یار کو بھول گئے کیا؟"

"کشن تم" وہ جذباتی ہو کے مجھ سے لپٹ گیا اور پھر میرے کاندھے پر سر رکھ کر رو پڑا۔ تھوڑی دیر رونے کے بعد اُسنے کہا۔ "سب کچھ بدل گیا۔ ایک محبت کرنے کی کتنی بڑی سزا مجھے ملی۔ مجھے گھر سے بے گھر کر دیا گیا۔ مجھ پر یہ الزام لگایا گیا کہ میں نے رشتے کے تقدس کو داغ لگایا۔"

"وہ سب تو ٹھیک ہے۔ پہلے مجھے یہ بتاو کہ تمہارری محبت کا کیا ہوا؟"

"نرملا کی محبت تو میں پا نہ سکا البتہ اسکا بدل میں نے ڈھونڈ لیا۔ میں نے اُسی کی چھوٹی بہن سے شادی کی۔ برسوں کی جنسی فاقہ کشی کے بعد میں اس لذت سے بہرہ ور ہوا۔ اب میں چار بچوں کا باپ بن چکا ہوں۔ زندگی جیسے تیسے گزر رہی ہے۔" کہہ کر وہ کسی اور ہی دنیا میں کھو گیا۔



گنیش بل کا باولا

جب ایک جنگلی جانور ہرنوں کے جھنڈ پر حملہ کر دیتا ہے تو پورے جھنڈ میں کھلبلی مچ جاتی ہے۔ کوئی دائیں بھاگتا ہے تو کوئی بائیں۔ انکا آپس میں کوئی تال میل نہیں رہ جاتا۔ ہر کوئی اپنی جان بچانے کی تگ و دو میں جائے امان ڈھونڈنے کے لئے بھاگتا ہے۔ ٹھیک یہی حال کشمیری پنڈتوں کا بھی ہوا۔ سن نوے کی شورش میں یہ لوگ وادی چھوڑ کر ملک کے کئی ساری ریاستوں میں جاکر پناہ گزیں ہو گئے۔ گنیش بل کا راج ناتھ بھی انہی بدنصیبوں میں سے ایک تھا جو اپنی ماں کا پہلا شرادھ بھی نہ کر سکا جس کا اس شورش سے دس مہینے قبل دیہانت ہوا تھا۔

گنیش بل ایک چھوٹا سا گاوں تھا جو کہ پہلگام سے لگی ایک پہاڑی پر واقع تھا۔ اصل میں یہ گاوں چیڑھ اور دیودار کے پیڑوں سے اسطرح گھرا ہوا تھا کہ یہ پہلگام کے اتنے قریب ہو کے بھی نظر نہیں آتا تھا۔ یہاں کی آبادی بڑی کم تھی۔ گو کہ یہاں بھی ہندو آٹے میں نمک کے برابر تھے، پھر بھی ہندو اور مسلمان مل جل کر رہا کرتے تھے۔ یہ گاوں بہت خوبصورت تھا۔ ہر طرف چھوٹی چھوٹی گنگناتی ندیاں اور اُچھلتی کودتی ہوئی دھارائیں لیدر کی طرف بہتی تھیں اور پھر اُسمیں ضم ہو جاتی تھیں۔ یہاں رہ کے بھی نالہ لیدر کی چیخ چنگھاڑ صاف سنائی دیتی تھی۔ راجناتھ اسی گاوں کا باسی تھا۔ وہ اسی گاوں میں پنساری کی دکان چلاتا تھا۔ اُسکی دنیا اپنی دکان سے گھر تک سمٹ کر رہ گئی تھی۔ اس گھر اور گاوں سے پرے کیا ہو رہا ہے اُسے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اُسکی دکان پر ہمیشہ پاس پڑوسیوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ زیادہ تر گاوں کی باتیں ہی زیرِ بحث ہوتی تھیں۔ اُسے اپنے گاوں سے اس قدر جذباتی لگاو تھا کہ جب وہ ایک آدھ

دن کے لئے سری نگر سودا سلف لینے چلا جاتا تھا تو اُسے لگتا تھا جیسے وہ کسی اجنبی شہر میں آ گیا ہو۔ اُسے شہری ماحول میں گھٹن ہونے لگتی تھی۔ وہ اپنے گھر اپنے گاؤں سے ایک پل کے لئے بھی دور رہنا نہیں چاہتا تھا۔ جب گرمیوں میں پہلگام میں سیاحوں کی آمد رفت شروع ہو جاتی تھی تو وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے بھانت بھانت کے لوگوں کو دیکھتا تھا جیسے وہ کوئی عجوبہ دیکھ رہا ہو۔ اُسے حیرت ہوتی تھی کہ یہ لوگ اپنا گھر بار چھوڑ کے یہاں کیسے آتے ہیں جب کہ وہ سری نگر سے باہر کبھی نہیں گیا تھا۔ اُسے اپنے گھر اور اپنے گاؤں کے مقابلے میں ساری دنیا ہیچ لگتی تھی۔

جب وادی میں شورش کی شروعات ہوئی تو اُس کے چند پڑوسی نقل مکانی کرنے لگے۔ وہ اپنے پڑوسیوں کے اس انخلا پر بڑا رنجیدہ ہوا۔ بھلا کوئی اپنا پنڈ اپنے یار دوست، اپنا پاس پڑوس چھوڑ کے جاتا ہے۔ چاہے یہ انخلا عارضی ہی کیوں نہ ہو۔ اصل میں شورش کی ابتدا پہلگام سے ہی ہوئی تھی۔ کئی مہینے پہلے چند غیر ملکی سیاحوں کا اغوا ہوا تھا۔ اُس دن راجناتھ کو لگا کہ کچھ گڑ بڑ ہے مگر وہ اس واقعے سے چندے خائف نہ ہوا کیونکہ اغوا انگریزوں کو ہوا تھا جو کہ غیر ملکی سیاح تھے اور پہلگام کی سیاحت کے لئے آئے تھے۔ اُسکے بعد کے واقعات پریشان کن ضرور تھے مگر راجناتھ تب بھی نہیں گھبرایا کیونکہ یہ گاؤں ایک کنبے کی طرح تھا۔ اُسکے مسلم پڑوسیوں نے اُسکی حفاظت کی ذمہ واری لی تھی اور وہ اُسے ایک پل کے لئے بھی اکیلا نہیں چھوڑتے تھے۔ ہر پل اُسکے ارد گرد منڈھلاتے رہتے تھے۔ اُنہیں اگر کوئی مشکوک آدمی گاؤں میں دکھائی دیتا تھا تو وہ اُسے روک کر اُس سے پوچھ تاچھ کر لیتے تھے۔ تسلی ہونے پر ہی اُسے چھوڑ دیتے تھے۔

جب حالات قابو سے باہر ہونے لگے اور ہر شخص اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کرنے لگا تو راجناتھ کے بال بچے خوف کے سایے میں جینے لگے۔ رات کو اگر ایک برتن بھی گر جاتا تھا تو اُنکی جان نکل جاتی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے موت اُنکے دروازے پر آ کے کھڑی ہو گئی ہو۔ راجناتھ کے گھر والے اس طرح کے خوف و دہشت کے ماحول میں جینے کے عادی نہ تھے اسلئے وہ راجناتھ کے پیچھے پڑ گئے کہ وہ بھی اُنہیں جموں لے کر چلا جائے۔ راجناتھ کا یقین بھی ڈانوڈول ہونے لگا تھا۔ اُسے بھی لگ رہا تھا کہ اب یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں۔ اُسکی برادری کے لوگ یہاں سے چلے گئے تھے۔ وہ تو اکیلا رہ گیا تھا۔ اُسنے

سوچا کہ یہاں اب اُسکی اور اُسکے عیال کی زندگی محفوظ نہیں سو بھاری من سے اُسنے گاوں چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ رات کے وقت اُسنے ایک دوست کی ٹیکسی میں اپنے بال بچوں کو بٹھایا اور وہ انہیں لے کر چوروں کی طرح گاوں سے نکل گیا۔ گھروالی کا اصرار تھا کہ وہ جاکر جموں میں رہیں مگر راجناتھ اسکے لئے راضی نہیں ہوا۔ کیونکہ وہ کٹر رجائی تھا۔ اُسکے دل میں یہ اُمید حالات کی ابتری کے باوجود ڈھلمل نہ ہو پائی تھی کہ آج نہیں تو کل حالات سدھر جائیں گے اور وہ پھر سے اپنے گھر میں جاکر رہئیں گے اسلیئے وہ زیادہ دور نکل نہیں جانا چاہتا تھا اُسکا بس چلتا تو وہ قاضی گنڈ سے آگے نہیں جاتا مگر یہاں بھی زندگی مامون نہیں تھی اسلیئے اُسنے مصلحت سے کام لے کر اُدھمپور میں جاکے ڈیرہ ڈال دیا۔ اُدھمپور جموں کے مقابلے میں سری نگر سے زیادہ قریب تھا۔ راجناتھ نے سوچا کہ جونہی حالات سدھر جائیں گے تو وہ سب سے پہلے اپنے عیال کو لے کے گھر لوٹ جائے گا۔ راجناتھ کے لئے شروع کے چند ہفتے بڑے تکلیف دہ اور جان گسل تھے۔ اُسے رات کو نیند نہیں آتی تھی۔ اُسے اپنا گھر اپنا گاوں شدت سے یاد آتا تھا اور گھر کی یاد اُسے لہولہو رلا دیتی تھی ۔ یہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ وہ خنک پروائیاں تھیں، نہ وہ شیتل پانی۔ نہ وہ سائیں سائیں کرتی ہوائیں، نہ گنگناتی ندیاں۔ نہ وہ ہرے بھرے جنگل نہ وہ برف پوش چوٹیاں۔ نہ وہ پرندوں کی چہکار، نہ وہ بھیڑ بکریوں کی ممناہٹ۔ نہ وہ لیدر کا سنگیت، نہ وہ بادلوں کا رقص۔ نہ وہ برسات کی رم جھم نہ وہ بادلوں کی گھڑ گھڑاہٹ۔ نہ وہ گھوڑوں کے سم کی ٹاپیں ، نہ وہ برف کے گالے۔ یہاں تو آسمان سے آگ برستی تھی۔ اُسے لگ رہا تھا جیسے اُسے جیتے جی ہی جہنم واصل کر دیا گیا ہو۔ وہ پاگلوں کی طرح دن بھر ادھر سے اُدھر بھٹکتا رہتا تھا۔ اُسے کوئی اپنا کوئی شناسا نظر نہیں آرہا تھا۔ اسے ہر شخص اجنبی اور بیگانہ لگتا تھا۔

ہر رات اُسکی ماں اُسکے سپنوں میں چلی آتی اور اُس سے پوچھتی۔ ''بیٹا میرا شرادھ کب کر رہے ہو؟''

ماں کو دیکھ کر وہ کرچی کرچی ہو کے رہ جاتا تھا۔ وہ جس حال میں اُسے بھٹکتے ہوئے دکھائی دیتی تھی وہ روپ دیکھ کر اُسکا کلیجہ پھٹ پڑتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو مجرم اور گناہ گار تصور کرنے لگتا تھا۔ کاش وہ دو مہینے اور رک گیا ہوتا اور ماں کا شرادھ کر کے ہی گھر چھوڑ دیا ہوتا تو آج اُسکی ماں کی آتما اُسے

اس طرح بھٹکتی ہوئی نہیں ملتی۔ وہ تو بس ہر رات اُسکے سپنے میں آ کر اُسے یاد دلاتی تھی کہ اُسے اُسکا شرادھ اپنے ہی پنڈ میں جا کے کرنا ہے تبھی اُسے مکتی ملے گی۔ اُدھمپور میں اور بھی دو چار مہاجر پریوار تھے۔ جب کبھی راجناتھ اُن سے جا کر ملتا اور اُن سے گھر لوٹ جا کر ماں کے شرادھ کی بات کرتا تو وہ اُسے یہ کہہ کر ڈراتے۔

''تمہاری مت ماری گئی ہے کیا جو موت کے منہ میں جانے کی سوچ رہے ہو۔ ارے بھیا کشمیر میں آج مسلمان محفوظ نہیں، ہماری تمہاری بات ہی کیا۔ دو چار لوگوں نے اس طرح کی حماقت کی۔ آج تک اُن کے بارے میں پتا نہیں چلا کہ آیا وہ زندہ ہیں کہ اُنہیں قتل کر دیا گیا ہے'' ایسی باتیں سن کر راجناتھ کا دل بیٹھا جانے لگتا تھا۔ مہینوں، سالوں وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپتا رہا۔ حالات سدھرنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ ایک پل کے لئے آس بندھ جاتی تھی تو دوسرے پل ٹوٹ جاتی تھی۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ صدیوں سے انگاروں پر لوٹ رہا ہو۔ کوئی اُمید، کوئی کرن اُسے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ رجائیت پسندی سے قنوطیت پرستی کی طرف بڑھ چکا تھا۔ اُسے لگ رہا تھا جیسے وہ ہر طرف اندھیرے سے گھرا ہو۔ گھر والے اُسکی یہ حالت دیکھ کڑھ کے رہ جاتے تھے۔ ایک دو بار اُسکی بیوی نے اُسکی خوب سرزنش کی۔ جواب میں وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کے رو پڑا۔ اُسے دیکھ کر گھر میں سب رونے لگے۔

دھیرے دھیرے اُسکا زندگی سے موہ بھنگ ہونے لگا۔ اُسنے چپی سادھ لی۔ نہ منہ سے بولتا تھا نہ سر سے کھیلتا تھا۔ بس گھنٹوں خلا کو گھورتا رہتا تھا۔ جب وہ اپنے گھر میں تھا تو وہ کتنا پھرتیلا اور چاک و چوبند تھا۔ وہ سورج اُگنے سے پہلے ٹھنڈے اور شیتل پانی سے نہا لیتا تھا اور پھر پاس کے مندر میں جا کر پوجا پاٹھ کر کے آتا تھا۔ پوجا پاٹھ کرنے کے بعد ہی وہ ان گرہن کرتا تھا۔ وہ اگر کسی دن بیمار بھی ہوا تب بھی اُسنے نہانے سے ناغہ نہیں کیا۔ یہاں آ کر وہ اپنا قاعدہ اور دستور ہی بھول گیا۔ یہاں آسمان سے آگ برستی تھی پھر بھی وہ نہاتا نہیں تھا۔ وہ جب سے یہاں آیا تھا اُسنے ایک بار کسی مندر کا رخ نہیں کیا۔ وہ پوجا ارچنا سب بھول چکا تھا۔ بیوی اُسے روز ڈانٹتی تھی مگر وہ بھی اتنا ڈھیٹ بن چکا تھا کہ اُس پر کسی ڈانٹ ڈپٹ کا اثر

نہیں ہو رہا تھا۔ وہ ایک کان سے سنتا تو دوسرے کان سے اُڑاتا تھا۔ دراصل اُسکے اندر کا انسان مر چکا تھا۔ اُسکی چونچال طبعیت کو اندر کے غم واندوہ نے نگل لیا تھا اور وہ رنج ومحن، درد والم کی ایک جیتی جاگتی مورت بن کے رہ گیا تھا۔ وہ دن بھر ڈنڈے بجاتا پھرتا رہتا تھا۔ مہینوں سے اُس نے اپنی داڑھی نہیں بنائی تھی۔ وہ ژولیدہ منہ لئے ایک پاگل کی طرح گھومتا رہتا تھا۔ اُسکی گھر والی اُسکی یہ حالت دیکھ کر چھاتی مسوس کے رہ جاتی تھی۔ اُسے یہ وہم ہوگیا تھا کہ راجناتھ اپنی سدھ بدھ کھوتا جا رہا ہے۔

ایک دن وہ کسی کو کچھ بتائے بنا گھر سے غائب ہوگیا۔ اُسکے بیوی بچے اُسکی گمشدگی سے پریشان ہوگئے۔ اُنہوں نے اُسے کہاں کہاں تلاش نہ کیا۔ اُسکا کوئی سراغ نہیں ملا۔ تھک ہار کے اُنہوں نے پولیس میں اُسکی گمشدگی کی رپورٹ درج کروائی۔ اُنکے کچھ رشتہ دار جو جموں میں رہتے تھے اُسکی گمشدگی کی خبر سن کر اُدھمپور چلے آئے۔ اُنہوں نے بھی اُسکی تلاش میں شہر کا کونہ کونہ چھان مارا مگر راجناتھ کی کوئی بو باس نہیں ملی۔ سب حیران تھے کہ آخر وہ گیا کہاں؟ اُسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ چند ایسے رشتہ دار بھی تھے جنہیں یہ اندیشہ ہو رہا تھا کہ کہیں کسی ملی ٹنٹ نے اُسکا اغوا تو نہیں کرلیا کیونکہ ایسے ایک دو واقعات ہو چکے تھے۔ ہر کوئی اپنی اپنی دانست کے حساب سے اٹکلیں لگا رہا تھا۔

راجناتھ اپنے گاؤں پہونچ چکا تھا۔ اُسنے کسی کو بتائے بنا یہ فیصلہ لیا تھا۔ وہ اس بات کو بخوبی جانتا تھا کہ اگر اُس نے کسی سے بھی اس بات کا زکر کیا تو کوئی اُسے ایسی حماقت کرنے کی اجازت نہیں دے گا۔ وہ اُسکی بات سننے کی بجائے اُسے ڈرا دیں گے۔ اُسے ایسی ایسی ڈراونی اور خوفناک کہانیاں سنائیں گے کہ اُسکی ہمت ٹوٹ جائے گی اور وہ گھر لوٹنے کی جرات ہی نہیں کر پائے گا۔ انہیں باتوں کو دھیان میں رکھ کر اُسنے کسی کو بھی اپنے فیصلے کی بھنک تک لگنے نہیں دی اور وہ رات کی تاریکی میں گھر سے نکلا اور ایک ٹرک میں بیٹھ کر اپنے گاؤں پہونچ گیا۔ جب اُسنے اپنے گاؤں میں قدم رکھا تو اُسے لگا جیسے وہ سورگ لوک میں پہونچ گیا ہو۔ وہ مٹی اُٹھا کر اسے اپنے سر اپنے ماتھے پر ملنے لگا اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ یہ غم کے نہیں بلکہ خوشی کے آنسو تھے۔ اُسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ وہ سچ مچ اپنے گاؤں، اپنے گھر پہنچ گیا ہو۔ پہلے تو لوگوں نے اُسے پہچانا نہیں کیونکہ اُسکا حلیہ ہی بدل گیا تھا۔ اُسکی داڑھی کافی بڑھی

ہوئی تھی۔ کپڑے تار تار ہو چکے تھے۔ بال بکھرے ہوئے اور چہرے سے وحشت برستی ہوئی۔ وہ عام انسانوں کی طرح نہیں تھا۔ وہ عجیب عجیب حرکتیں کر رہا تھا۔ اُسکے رنگ ڈھنگ دیکھ کے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا ہے۔ جب گاوں والوں نے اُسے پہچان لیا تو اُنہوں نے اُسے گلے لگانا چاہا مگر وہ تو ایسا برتاو کرنے لگا جیسے وہ کسی کو پہچانتا ہی نہ ہو۔ وہ بس اللہ و اکبر کا ورد کرتا رہا۔ کچھ لوگ تو اُسکا حال حلیہ اور اُسکا اللہ اکبر کا ورد کرتے ہوئے شادمان ہو گئے۔ اُنہیں لگا کہ راجناتھ نے اپنا مذہب بدل دیا ہے اور اسلام سے متاثر ہو کے وہ مسلمان ہو گیا ہے۔ یہاں پر ہندو ہوتے تو وہ اسے ذات باہر کر دیتے مگر یہاں تو اب اُس طبقے کا کوئی بھی فرد نہیں تھا۔ بہر حال وہ جسطرح بھی برتاو کر رہا تھا یہاں کے لوگ اُسے سر آنکھوں پر بٹھا رہے تھے۔ رات کو جب وہ ایک دکان کے تھڑے پر لیٹ گیا تو ایک آدمی بھاگ کے گھر گیا اور وہاں سے رضائی لے کے آیا اور یہ رضائی اُسکے اوپر ڈال دی۔ وہ ہر رات اپنا رین بسیرا بدلتا رہتا تھا۔ وہ جہاں بھی سو جاتا تھا کوئی نہ کوئی گھر سے رضائی لا کے اُس پر ڈال دیتا تھا۔ اُسکے پیچھے کھانا لے کے دوڑتے۔ وہ نا نا کرتا تب بھی اُسے دو نوالے کھلا ہی دیتے تھے۔

گاوں کی پنڈال پر روز اُسکا چرچا ہوتا تھا۔ کئی لوگوں نے اُسے مسجد میں لیجانے کی کوشش کی مگر وہ غیض و غضب ہو کے بھاگ جاتا تھا اور پھر جلال میں آ کے اللہ و اکبر کا ورد کرنے لگتا تھا۔ لوگوں کے لئے وہ ایک پہیلی بن کے رہ گیا تھا۔ وہ اگر مسلمان ہو گیا ہے تو پھر مسجد میں جانے سے احتراز کیوں کر رہا ہے۔ بزرگوں نے جب اس مسلے پر مغز پچی کی تو اُنہیں یہی ادراک ہوا کہ وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہے اسلئے وہ اس قسم کی حرکتیں کر رہا ہے۔

ایک دن کیا ہوا کہ اس گاوں کا ایک مسلمان حاجی اکرم ایک پنڈت کی زمین کا سودا کرنے کے لئے جموں چلا گیا۔ وہ جب اُس پنڈت کے گھر پہونچا تو اُن کی حالت کذائی دیکھ کر اُسے صدمہ ہوا۔ وہ تو ایک کمرے میں جانوروں کی طرح رہ رہے تھے جس میں نہ بجلی کا پنکھا تھا، نہ کھانا پکانے کی رسوئی۔ وہ تو جیتے جی ہی دوزخ کی آگ میں جل رہے تھے۔ حاجی پر رقت طاری ہوئی۔ یہ اُسکا پڑوسی شمبھو ناتھ تھا جس کا گنیش بل میں سات کمروں والا گھر تھا۔ بیس پچیس کنال زمین تھی اور وہی آج اپنے عیال کے

ساتھ ایسی کسم پرسی کی حالت میں رہ رہا تھا۔ اُسنے شمبھوناتھ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''اس طرح اس جہنم میں رہنے سے اچھا ہے اپنے گھر لوٹ چلو۔ اس ڈر کو اپنے دل سے نکال دو کہ وہاں جا کر تمہیں ہم مار ڈالیں گے۔ تمہارا ایک پڑوسی راجناتھ تو لوٹ کے آیا ہے۔ گو کہ وہ اپنے ہوش وحواس میں نہیں ہے، پھر بھی دیکھو اُسکا گاوں والے کس طرح خیال رکھتے ہیں۔''

اس انکشاف سے شمبھوناتھ اُچھل پڑا۔ اُسنے حاجی اکرم کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ کر پوچھا۔

''مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔ تم سچ کہہ رہے ہو حاجی؟''

''بھائی مجھے جھوٹ بول کے کیا ملنے والا ہے۔ میں سچ کہہ رہا ہوں کہ راجناتھ لوٹ کے آیا ہے مگر یہ خبر سن کے تمہیں دکھ ہوگا کہ اُسنے اپنا دین بدل دیا ہے اور وہ مسلمان بن چکا ہے''

شمبھوناتھ کو لگا جیسے اُسکے سینے پر ایک وزنی گھونسہ پڑا۔ اس انکشاف نے اُسے اندر سے پلپلا کے رکھ دیا۔ ایک عیال بار آدمی اپنے عیال کو چھوڑ کے اپنا دھرم بدل لے۔ وہ اُسے دل ہی دل لعنت ملامت کرنے لگا۔ اُس سے رہا نہ گیا۔ وہ حاجی سے بے دغدغے بولا۔

''لعنت ہے اُس پر۔ اپنے بچوں کو بھگوان کے رحم کرم پر چھوڑ کر وہ یہاں سے بھاگ گیا اور اپنا دھرم کرم بھول کر دوسرے دھرم کی شرن میں پہونچ گیا۔ اُسے نہ یہاں چین ملے گا نہ وہاں۔ ارے اُسے دھرم ہی بدلنا تھا تو پھر شادی کیوں کی۔ بچے کیوں پیدا کیئے۔؟ اُسے جانا ہی تھا تو پہلے انہیں زہر دیکر مار ڈالنا تھا۔ وہ جب یہ خبر سنیں گے تو بے موت ہی مر جائیں گے۔''

حاجی چپ چاپ اُسکی جلی کٹی سنتا رہا۔ اُسکی باتیں تلخ سہی مگر کسی حد تک سچ تو تھیں۔ راجناتھ نے اپنے دین سے ہی نہیں اپنے بال بچوں کے ساتھ بھی دھوکہ کیا تھا۔ وہ اُنہیں بے یارومددگار چھوڑ کے چلا گیا تھا۔

یہ بات جموں کے شرنارتھی کیمپ میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ جو بھی یہ خبر سنتا وہی راجناتھ پر تھو تھو کر کے چلا جاتا تھا۔ حاجی اکرم جس کام کے لئے آیا تھا وہ کام تو ہوا ہی نہیں۔ وہ

راجناتھ کے دھرم پریورتن کی بھینٹ چڑھ گیا۔ اُسے خالی ہاتھ لوٹنا پڑا۔ وہ اپنے آپ کو کوسنے لگا کہ اُسنے راجناتھ کی خبر سنا کر اپنے ہی پاوں پر کلہاڑی ماری۔ اُسے راجناتھ کا زکر ہی کیوں کرنا تھا۔ باڑھ میں جاتا وہ۔ مسلمان بن کے وہ کونسا اُس پر احسان کرنے والا تھا۔ اُسنے دین بدلا تو اپنے لئے بدلا۔ کیا پتا اس تبدیلی مذہب میں اُسکی کیا مصلحت رہی ہو۔ ہر انسان جو بھی کرتا ہے اپنے فائدے کے لئے کرتا ہے۔ چونکہ وہ اُسوقت غصے میں تھا اسلئے اُسنے راجناتھ کی دماغی صورت حال کو اُس وقت نظر انداز کیا مگر جب وہ اننت ناگ جانے والی بس میں بیٹھ گیا تب اُسے راجناتھ کی موجودہ صورت حال کی طرف دھیان گیا۔ اُسے اُس آدمی پر ترس آگیا۔ وہ تو اپنے جامے میں تھا ہی نہیں اسلئے اُسے یہ بھی پتا نہیں تھا کہ اُسنے کیا کیا ہے۔

چار دن کے بعد جب حاجی اکرم اپنے گھر پہونچا تو گھر والوں نے آتے ہی اُسے گھیر کے پوچھ لیا۔

''ہو گیا سودا کیا؟''

''نہیں۔''

''کیوں۔ شمبھوناتھ نے زمین بیچنے سے انکار کیا؟''

''نہیں۔''

''تو پھر زمین کا سودا کیوں نہیں کیا؟''

''دل نے نہیں مانا''

اُسکی بیوی تنک کر بولی۔

''دل کی بات ہی سننی تھی تو یہیں سنتے۔ اتنے دور جا کر سننے کی کیا ضرورت تھی؟''

''دراصل بات یہ ہے کہ راجناتھ کی وجہ سے یہ سودا نہیں ہوا۔''

''راجناتھ تو یہاں ہے۔ وہ بھی دیوانگی کی حالت میں۔ وہ بھلا تمہارا سودا کیوں بگاڑ دیتا۔ بات کچھ اور ہے''

''ہاں بات کچھ اور ہے۔ دراصل میرے منہ سے نکل گیا کہ راجناتھ نے اپنا دین بدل

دیا ہے۔اس خبر سے وہاں کہرام مچ گیا۔ ہرایک کو اُسکے اس فیصلے پر افسوس ہوا کیونکہ اُسکے بال بچے بھی ہیں جن کا کوئی پرسان حال نہیں ۔ بھلا کوئی اپنے معصوم بچوں کو اسطرح دوسروں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیتا ہے ۔اس ہنگامے میں زمین کی بات ہی ہونہ پائی۔"

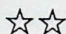
حاجی کی بیوی نے بھی اس بات کی تائید کی کہ اُسے دین بدلنے سے پہلے اپنے بچوں کے بارے میں سوچنا چاہے تھا۔اب کون اُنکی سدھ لے گا۔اکیلی عورت بیچاری کیا کر پائے گی۔کس طرح اپنے بچوں کو پالے گی ۔ یہاں ہوتی تو بات کچھ اور تھی۔ یہاں اُسکی اپنی زمین زراعت تھی۔ وہاں کیا ہے۔ آگے ہاتھ تو پیچھے پات۔ یہ بحث رات گئے تک چلتا رہا۔

جب حاجی اکرم سونے کے لئے اپنے کمرے میں چلا گیا تو اُس نے گھر کے پچھواڑے میں کچھ گرنے کی آواز سنی۔ وہ اُلٹے پاوں نیچے چلا آیا۔ٹارچ کی روشنی میں دیکھا کہ ایک بلی نے چوہے کو اپنے منہ میں دبالیا ہے۔اُسنے بلی کو لکڑی مار کے بھگا دیا۔ وہ جب واپس اپنے کمرے کی طرف جارہا تھا تبھی پاس کے مندر میں اُسے کوئی سایہ ہلتا ہوا نظر آیا۔اُسے لگا کہ کوئی شر پسند مندر میں گھس گیا ہے۔ وہ دبے پاوں مندر تک گیا۔ اندر جب اُسنے دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا تو وہ دیکھ کے حیران وششدر رہ گیا۔ اندر راجناتھ اپنی ماں کی تصویر کو سامنے رکھ کر اُس کا شرادھ کر رہا تھا۔ دفعتاً راجناتھ کی نظر حاجی اکرم پر پڑی تو وہ سن ہو کے رہ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ بھاگنے کی کوشش کرتا حاجی اکرم نے اُسکا راستہ روکا۔ وہ منجمد ہو کے حاجی اکرم کے سامنے کھڑا تھا۔حاجی اکرم کا گلا بھر آیا۔اُسنے بھرے گلے سے کہا۔

"یہ سوانگ رچانے کی کیا ضرورت تھی۔تم اگر یہ چولا بدل کر نہیں آتے تو کیا ہم تمہیں اپنے گھر میں گھسنے سے روکتے ؟ تم نے ہمیں اتنا غیر اور بے درد کیسے سمجھا۔جس ماں کا شرادھ کرنے تم آئے ہو وہ جتنی تمہاری ماں تھی اُتنی ہی میری بھی تھی۔ہم نے اُسے کبھی مذہب کے ترازو پر نہیں تولا۔ماں کی ممتا کو کبھی تولا نہیں جاتا ہے اور نہ ہی کسی آلے سے آنکا جاتا ہے۔ ماں تو ماں ہوتی ہے جس کا سب سے بڑا دھرم ،سب سے بڑا مذہب اُسکی ممتا ہوتی ہے اور وہ یہ ممتا بنا کسی سود کے سب میں بانٹتی ہے۔حالات کے اندھیرے میں رشتے بھلے ہی دھندلے ہو جائیں مگر یہ رشتے کبھی مرتے نہیں ، بلکہ ہمیشہ زندہ رہتے

ہیں کیونکہ ان کی جڑیں دلوں میں پیوست ہوتی ہیں۔"

کہہ کر وہ تیزی سے نکل گیا۔ راجناتھ کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی اور وہ ماں کی تصویر کے سامنے بیٹھ کر چھاجوں روتا رہا۔



مصنف کی دیگر تصانیف

☆ کشمکش	ناولٹ	پرواز پبلکیشنز لدھیانہ۔ پنجاب
☆ تماشہ	ناول	روحی پبلکیشنز۔ بڈگام۔ کشمیر
☆ ترنگ	ناول	کتاب والا پبلکیشنز۔ دہلی
☆ نیا سفر	ناولٹ	کتاب والا پبلکیشنز۔ دہلی
☆ دردانہ	ناولٹ	کتاب والا پبلکیشنز۔ دہلی
☆ برف کی آگ	افسانوی مجموعہ	رہبر پبلکیشنز۔ دہلی
☆ ہم تیرے ہو گئے	ناولٹ	راہی پبلکیشنز۔ دہلی
☆ دلیپ صاحب	ناسٹلجیا	پرائم ٹائم پبلشرس۔ لاہور
☆ پمپوش	افسانوی مجموعہ	راہی پبلکیشنز۔ دہلی
☆ چالاک سوداگر	بچوں کی کہانیاں	رحمانی پبلکیشنز۔ مالیگاوں (ناسک)
☆ لال پل کا دیوانہ	افسانوی مجموعہ	
☆ سلام دین کا ہاوس بوٹ	ناول	میزان پبلشرس۔ سری نگر
☆ میرے گاوں کا چنار	افسانوی مجموعہ	
☆ پوش مال	افسانوی مجموعہ	
☆ ہندی فلموں کے معمار	فلمی مضامین	علم و عرفان پبلشرس۔ لاہور
☆ راہی بھول نہ جانا	ناول (زیر طبع)	جواہر پبلشرس۔ ممبئی
☆ شہنشاہ جذبات دلیپ صاحب	ناسٹلجیا	میزان پبلشرس۔ سری نگر



اعلی انسانی سوچ، بہترین لفظوں کے ساتھ، بہت رواں جیسے کسی پہاڑی سے جھرنا بہہ کر زمین پ[illegible]ہو۔ قاری اس بہاو کے ساتھ، واقعات کے اُتار چڑھاو کے ساتھ اُترتا اور چڑھتا ہے اور یقیناً یہ کمال فن ہے جس کی داد قدرت کو دیتا [illegible] اپنی مخلوق میں [illegible] ایک تخلیق (دیپک کنول) کو چن کر اس کے حوالے کر دیتی ہے۔ طفیل اختر ۔ایڈیٹر ''مسکراہٹ'' لاہور۔

آپ نے سماج کے اصلاحی کرداروں سے روشناس کرایا ہے۔ زبان مہذب، پاکیزہ، سادہ، [illegible] رواں جو قاری [illegible] ساتھ لئے چلتی ہے۔ آپ کے افسانوں کے کرداروں میں ایک ناصح، ہمدرد، سماج کی اصلاح کرنے والے اور [illegible] دل رکھنے وا[illegible]ن کو دیکھا جا سکتا ہے۔ تمام کہانیاں کشمیری تہذیب اور ثقافت کی عکاسی کرتی ہیں جن میں چنار کی خوشبو، چشم[illegible] دلفریب منظر [illegible]میر کی خوبصورتی نمایاں ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ نارنگ ساقی ۔ نئی دلی آپ ایسے تخلیق کار ہیں جو موضوع اور واقعہ کی بڑی گہرائی سے چھان پھٹک کرتے ہیں۔ اس وجہ سے کہانی میں حقیقت کا بھرپور احساس ہوتا ہے اور وحدت تاثر سے ذہن کو سکون ملتا ہے۔

نعیم کوثر ۔ایڈیٹر ''صدائے اُردو'' بھوپال

دیپک کنول کے افسانے زندگی سے جڑے ہوئے ہیں اسلئے ذہن و دل کو بیک وقت متاثر کرتے ہیں۔ انہیں زبان پر بھی گرفت حاصل ہے۔ زندگی کے بارے میں وہ تعمیری نظریہ رکھتے ہیں۔ اس سے ان کے افسانوں پر نکھار آیا ہے۔ وہ افسانہ نگاری کے فن سے بخوبی واقف ہیں۔ عرش صہبائی۔ جموں

آپ صاحب اسلوب افسانہ نگار ہیں اور آپ کے افسانے ہماری معاشرتی زندگی کا آئینہ ہوتے ہیں۔ پھر دلچسپ بیانیہ اور سادہ سلیس زبان کی بدولت یہ افسانے تاثر پزیری کے حامل بھی ہوتے ہیں۔ سعید رحمانی۔ ایڈیٹر ''ادبی محاذ'' کٹک (اُڑیسہ)

کشمیر کے المیے کے پس منظر میں لکھی گئی کہانیاں آپ کے حساس اور دردمند دل کی آئینہ دار ہیں۔ یوں بھی ان سبھی افسانوں کا تعلق دل سے ہے عقل سے نہیں۔ آپ کا سلیس اوور سادہ لب ولہجہ بہت موثر ہے۔ کہیں بھی کوئی اُلجھن یا معمہ بازی نہیں۔ آپ کا بیانیہ اور واقعات کی روانی لائق ستائش ہے۔ اُس برے وقت کی تصویریں جس کمال چابکدستی سے آپ نے اپنے قارئین کو دکھائی ہیں، کئی بار پڑھتے پڑھتے بے اختیار آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ کئی جگہوں پر آپ نے کچھ کہاوتوں کا جو برمحل استعمال کیا ہے وہ حقائق کی منظر کشی کو اور بھی دل پزیر بنا دیتا ہے۔

مہندر پرتاپ چاندا۔ انبالہ (ہریانہ)

آپ کو پڑھنے کا ایک مدت سے اتفاق رہا ہے۔ مجھے فقط اتنا ہی کہنا ہے کہ آپ بہت اچھا لکھتے ہیں اور آپ کی کہانیاں قاری کے رگ و ریشے میں سرائیت کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ یوگندر سنگھ بہل تشنہ نئی دہلی۔

Jawahar Publications
16/4 Renaissance C H S Plot- 9 sector -8
Nahada Malwani-Malad (w) Mumbai -400095